

DATA ENTERED

سلسلہ مطبوعات نمبر ۸۲

276

تعمیری انقلاب

اور

قرآنی اصولِ حکمت

از:-

حیدر زمان صدیقی

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

جملہ حقوق محفوظ

۱۹۵۰ء

بار اول

۲۹۲۵۹.۹
۱۵۲
۲۹۱۸۰

قیمت _____ فی جلد _____ دورہ چہ چہ آنہ

شیخ نیاز احمد پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس میں چھپوا کر کشمیری بازار لاہور
_____ سے شائع کیا _____

فہرست

صفحہ	نگاہِ اولیں
۵	کامل اور صالح معاشرہ کا قرآنی تصور ✓
۹	اسبابِ زوالِ اُمت کا عقلی تجزیہ
۲۷	تاریخِ زوالِ اُمت کا تحقیقی جائزہ
۴۶	مسلمانوں کی ثقافتی تبدیلی کا تاریخی پس منظر
۸۵	اسبابِ فساد کے اعتبار سے اُممِ اسلامیہ
۹۶	حاضرہ کا موقف
۱۱۰	مباحثِ ماضیہ پر نظر ثانی
۱۱۸	تعمیر و ارتقاء تمدن کے دو متضاد نظریے
۱۳۲	پنجمیہ رائے و دعوتِ انقلاب — اور
۱۴۳	اسکے اصول و مبادی
۱۴۳	آج نظامِ اسلامی کی عملی تشکیل کیسے ہو سکتی ہے؟ ✓

دورِ ماضی کی تعمیری اور انقلابی کوششوں پر
تنقیدی نظر۔
مستقبل کی تعمیر کا نقشہ کار۔

۱۸۶

۲۰۹

حَامِدًا وَمُصَلِّيًا

نگاہِ اولیں

سپاہِ تازہ بر انگیزم از ولایتِ عشق

کہ در حرمِ خطر سے از بناوتِ خرد مہت

تہذیبِ حاضرہ نے انسانی ذہن کو اس درجہ زہرناک بنا دیا ہے کہ اسکی سمیت سے انسانیت کا ریشہ ریشہ مسموم ہو چکا ہے۔ دین و مذہب کا کوئی گوشہ ہر گہر اصولِ انسانیت کی کوئی کرہ سی، اور آفاق گیر اقدارِ حیات کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اسکے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ گیا ہو۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج انسانیت بسترِ مرگ پر دم توڑ رہی ہے۔ قلب و روح کی تمنائیں پامال ہو رہی ہیں۔ اقوامِ حاضرہ کی باہم بہیمانہ کشاکش نے انسان آبادیوں کو جہنم زار بنا رکھا ہے۔ اور آج روٹے زمین پر امن و سکون کی کوئی شعاع۔ احت و طمانیت کی کوئی رمق، اور دیانت و صداقت کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔

سطحی نظر سے دیکھنے والوں کے نزدیک عالمِ انسانی کا یہ عالمگیر اضطراب محض خارجی اسباب و غلغل کا نتیجہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انکی توجہ حیاتِ اجتماعیہ کی بیرونی سطح پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ مگر اہل نظر کے نزدیک دور

تو محض راہ کی مشکلات کے خیال سے انسانیت کی اس سب سے بڑی خدمت سے دست بردار ہو جانا اور دیکھتے ہوئے کہ عصر حاضر کا انسان ہلاکتِ تباہی کی راہ پر گامزن ہے اسکو سنبھالنے کی کوشش نہ کرنا آخر کہاں کی دانشمندی ہے؟ حق یہ ہے کہ یہ ایک نہایت ذلیل اور شرمناک طرزِ عمل ہے۔ اور مردانِ راہِ حریت و عزیمت کی نظر میں اسکے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

گذشتہ دو ڈھائی سال سے جن لوگوں نے اپنی قوم کی انفرادی و جماعتی سیرت کا جائزہ لیا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کا ہر قدم کس جانب کو بڑھ رہا ہے۔ اور اس کی خطرناک اخلاقی پستی اسکو کس طرف لے جا رہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو و فرنگی اپنے ذمہ اخلاق اس قوم کے حوالے کر گئے ہیں۔

از فرنگی می خرد لات و منات

مومن و اندیشہ او سو منات

غرض اس مدت میں ہمنے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے، اسکے تصور ہی سے جگر کا نیا اٹھتا ہے۔ اور سیرِ ندامت جھک جاتا ہے۔ ایسی تشویشناک حالت کو دیکھ کر نگاہِ تجسس کے لئے فروری ہو جاتا ہے کہ وہ اسکے اسباب و داعیات کی ٹوہ لگائے۔ اور پھر اصلاحِ حال کی جو صورت ممکن ہو اس کو پیش کرے۔

یہ کتاب اسی ذہنی تاثر کی آئینہ دار ہے۔ دما توفیقی الا باللہ

صدیقی

کامل اور صالح معاشرہ کا قرآنی تصوّر

ایک طرف عالم امروز کے حسین و جمیل منظر ہیں جو ہماری نگاہوں کو برابر دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ اسکی نظر فریب دینا یا غنقوانِ شباب اور دلکش ادائیں تکمیلِ حسن کی شہادت دے رہی ہیں۔ مگر دوسری طرف زندگی کی پامال، مضحک اور بے قرار تمنائیں ہیں جو اس ہنگامہ ہستی کے گہوارہ امن و راحت اور مرتعِ جمال معنوی بننے کے لئے مضطرب اور متعطف فردا ہیں۔ قلب کی ہر دھڑکن سے پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ محض فریبِ نگاہ ہے۔ اور جسکی طلب و جستجو ہے اس کا اب تک سراغ ہی نہیں ملا۔ قلب و نگاہ کی یہ آویزش اور حقیقت و مجاز کا یہ تضاد کیوں ہے؟ کیا سوچنے والوں نے کبھی اس مسئلہ پر بھی غور کیا ہے؟ دتیا کے وہ جلیل القدر ماہرِ عمرانیات اور بلند پایہ علماء سائنس جو زمین کے لاتعداد خزائن دریافت کرنے۔ عناصر کی خاصیتیں معلوم کرنے اور انکی ترکیب سے نئے نئے اکتشافات کو بروئے کار لانے اور پھر آسمان کی بلندیوں تک رسائی حاصل کرنے میں اپنے علمی اور سائنسی کمالات کو عالم آشکار کر چکے ہیں۔ کیا وہ اتنی سی بات بھی نہیں بتا سکتے کہ تمہاری یہ

عجوبہ کاریاں جو لگا ہوں سے خراجِ تحسین پاپچی ہیں، دلوں کے ویرانوں کو آباد کرنے میں کیوں ناکام رہی ہیں؟

عشقِ ناپیدِ خرد می گزرتش صورتِ بار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کرنے سکا
ڈھونڈنے والا ستارہ کی گذرگا ہوں گا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے سکا
کائنات کی اصل کیا ہے۔ زندگی کے تقاضے کیا ہیں۔ اور زندگی کا حقیقی
ارتقاء کیا ہے؟ یہ وہ مسائل ہیں جو آج تک اربابِ حکمت و فلسفہ کا موضوعِ
بحث بنے رہے ہیں۔ اور جب تک کائنات کا نظام قائم ہے، آئندہ بھی یہ
مسائل مرکزِ توجہ بنے رہیں گے۔ مگر زندگی ایک انتہا سمندر ہے جسکی گہرائیوں
کو اب تک نہ کوئی پاسکا ہے اور نہ آئندہ پاسکے گا۔

بہت دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ارتقاء تمدن کے مسئلہ ہی کو لیجئے
خود ارتقاء کا مفہوم کیا ہے، اور ارتقاء تمدن کا بنیادی تصور کیا ہے؟
سیکڑوں علما و مفکرین نے اپنے اپنے مخصوص اندازِ فکر سے اس مسئلہ کو
سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ افلاطون اور ارسطو ہوں یا روسو اور کارل
مارکس سب نے اس عجیب و غریب اور پیچ در پیچ عقدہ زندگی کو حل کرنا چاہا
لیکن ان کی پیہم کوششوں کے باوجود اصل مسئلہ پہلے سے زیادہ الجھتا
چلا گیا۔

ما کل من شمس نال دائمۃً للناس فی ذاتبائین عجیب
ہینگل جیسا شہرہ آفاق فلسفی مدتوں اس لیلائے مقصود کی تلاش میں
دشتِ جنوں کی خاک چھانتا پھرا، اور گلشنِ ہستی کے مرجھائے ہوئے پودوں

کو خونِ جگر دے دیکر سینچا کیا۔ لیکن اس کی انتھک محنت اور مسلسل دماغی کاوش
 نظریہ جدلیت پر پہنچ کر رک گئی۔ یعنی اس نے اس نئے انداز میں مسئلہ ارتقا
 کی توجیہ کی۔ کہ ہر موجود تصور سے ایک نیا صالح تصور پیدا ہوتا چلا جاتا ہے
 جو پہلے تصور کی ضد ہوتا ہے۔ مگر یہ جدید تصور پہلے تصور کے مفید اور صالح
 اجزاء کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور اسکے فاسد و ناکارہ اجزاء کو ضائع
 کر دیتا ہے۔ یہ سلسلہ ارتقا ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔
 یہاں تک اخیر میں ایک تصور مطلق جو ہر دور کے صالح اور کارآمد اجزاء کے
 مجموعہ سے عبارت ہے معرض وجود میں آئے گا۔

نظریہ جدلیت کے اختراع سے اس نے یہ سمجھ لیا کہ بس اب جس چیز کی
 تلاش تھی وہ مل گئی۔ اور جس مسئلہ کو حل کرنے میں ہزاروں مفکرین کی دماغی
 کوششیں ناکام رہی ہیں اب وہ بالکل حل ہو گیا۔ اور کارل مارکس کے نزدیک
 اسی طرح کی ارتقائی حرکت نظام تمدن و معیشت میں جاری رہتی ہے اور اس
 سلسلہ ارتقا کی آخری کڑی اسکے نزدیک کامل معاشرہ یا مثالی سوسائٹی ہے
 مگر ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان حضرات نے مسئلہ ارتقا کی جو توجیہ کی ہے،
 وہ بذاتِ خود ایک چستان ہے۔ واقعات و حقائق کی روشنی میں ہم دیکھتے
 ہیں کہ جو نیا تصور اجتماع یا نظام تمدن معرض وجود میں آتا ہے۔ وہ پہلے عیوب
 و مفاسد کے علاوہ صد ہائے امرات اس مقام اپنے ہمراہ لاتا ہے۔ ہم
 سے ہم حتمی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا میں ہیکل کے تصور مطلق کے لئے کوئی
 گنجائش ہے اور نہ کارل مارکس کی مثالی سوسائٹی کے لئے کوئی جگہ ہے۔

اگر کسی خطہ ارضی میں کسی فوق الفطرت ہستی کی مقدس جدوجہد سے فاسد معاشرہ میں صالح انقلاب رونما ہوتا ہے تو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پاتا کہ نئے سرے سے شر و فساد کی طاغوتی قوتیں معاشرے کے اندر ہی سے ابھر آتی ہیں۔ جو اس کا فساد و تخریب کے اسی موقف پر کھڑا کر دیتی ہیں۔ جس پر وہ پہلے تھا۔ بلکہ اکثر بیشتر حالات میں بعد کی حالت پہلی حالت سے زیادہ فاسد اور پرخطر ہوتی ہے۔ ان قطعی حقائق کے پیش نظر ہر وہ شخص جس کو خدا نے تھوڑی سی بھی بصیرت عطا کی ہے وہ بڑی آسانی سے اس بات کو تسلیم کرے گا کہ ان مفکرین نے ارتقاء تمدن کی جو توجیہات کی ہیں وہ ناقص ہی نہیں بلکہ سراپا غلط اور خلاف واقعہ ہیں۔

ہاں کارل مارکس اور لنین کی خدائی کو ماننے والے لوگ یقیناً کہیں گے کہ بھائی! آج دنیا کے ایک بڑے حصہ (سویٹ یونین) میں ارتقائی معاشرہ کی ایک مثال موجود ہے۔ اور کارل مارکس کی روح دنیا کے دوسرے خداؤں کو چیلنج کر رہی ہے کہ "ہل من خالق غیر ی؟"

بات یہ ہے کہ ہمیں اس معاشرہ کو ارتقائی معاشرہ کہنے میں کوئی تامل نہایتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس ارتقائی معاشرہ اور پہلے کے "غیر ترقی یافتہ" معاشرہ میں اگر کوئی فرق ہے تو بس اتنا ہی ہے کہ پہلے لاقانونی۔ اور غیر جمہوری طریقوں سے انسانیت کو ذبح کیا جاتا تھا۔ اور اب قانون اور جمہوریت کے نام سے اخلاق و شرافت کو رسوا اور انسانیت کو پامال کیا جا رہا ہے۔

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہوا قوم کی منشا

ہمیں خوب معلوم ہے کہ اشتراکی ڈکٹیٹر شپ نے خود ساختہ اصول و
تصورات (مارکسزم) کے نام سے جس طرح کروڑوں ناکردہ گناہ انسانوں کو
تختہ دار پر لٹکایا اور لاکھوں کو جلا وطن کیا اسکی مثال پہلے کسی بدترین دور
استبداد میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ ان لوگوں کا جرم صرف اتنا ہی تھا
کہ یہ لوگ کارل مارکس کی الوہیت پر ایمان نہ لاسکے تھے۔ یا ان کی نسبت یہ شبہ
تھا کہ وہ اندر سے منافق ہیں۔ اور آج بھی کروڑوں کی اس وسیع و عریض آبادی
میں چند اشتراکی بھٹیڑیوں کے سوا کسی کی جان محفوظ نہیں ہے۔ اور ہر
باشندہ ملک کی موت و حیات موجودہ مطلق العنان ڈکٹیٹر شپ کے
قبضہ اختیار میں ہے۔

لے واسے بہانے اگر این ہست بہار

ہاں اگر اشتراکیوں کے نزدیک ارتقائی معاشرہ کا مفہوم بس اتنا ہی
ہے کہ ہر شخص کو پیٹ بھر کر روٹی اور پہننے کے لئے کپڑا میسر ہو تو ان معنوں
کے لحاظ سے وہ اپنے دعویٰ میں حق بجانب قرار دیے جاسکتے ہیں۔ لیکن
ہم جس معاشرہ کو ارتقائی معاشرہ کہتے ہیں، اس کا معیار ارتقاء اس کے
بالکل مختلف ہے۔

رَاحَتٌ مُشْرِقَةٌ وَرِحْتُ مُغْرِبًا

شَتَّانَ بَيْنَ مَشْرِقٍ وَمُغْرِبٍ

حضرت امام ولی اللہؒ نے "ملتِ قصویٰ" کا تصور پیش کیا ہے، لیکن
لیکن ان کے نزدیک یہ ممکن الوقوع نہیں ہے۔ وہ خود ہی "بدورِ پارِ نہ"
میں لکھتے ہیں کہ ملتِ قصویٰ کے تصور سے مقصود صرف اتنا ہے کہ اسکو مثالی
حیثیت سے تسلیم کیا جائے اور اسکو سامنے رکھ کر آگے بڑھنے اور زیادہ
زیادہ اس سے مناسبت پیدا کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ آپ لکھتے ہیں کہ
ملتِ قصویٰ خارج میں اسوقت متحقق ہو سکتی ہیں، جبکہ معاشرہ کے تمام
افراد تقویٰ و طہارت اور سیرت و اخلاق کے اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچ
جائیں، مگر ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

متذکرہ بالا توضیحات سے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا
قرآنی تصور ارتقاء ہوتا ہے کہ اگر آج تک دنیا کے اعلیٰ علم و دانش
 اور شہرہ آفاق اربابِ فکر عقدهٔ زندگی کو حل کرنے میں قطعی ناکام رہے ہیں
 اور انہوں نے ارتقاء انسانیت کی جو سمت متعین کی ہے۔ وہ درحقیقت ہلاکت
 و بربادی کی سمت ہے۔ تو کیا فی الواقع کوئی ایسا تصور ارتقاء موجود ہی نہیں
 ہے جو بھٹکے ہوئے انسانوں کا رخ انسانیت کی حقیقی منزل مقصود کی طرف
 پھیر سکے؟ یہی وہ بنیادی مسئلہ ہے، جو اس وقت کاوشِ فکر و نظر کا
 محتاج ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے شعور نظری کی مدد سے ہمیں اس مسئلہ
 کا حل دریافت کرنا پڑے گا۔ کہ کیا انسانی زندگی کو راہِ عدل پر چلانے کے لئے
 کوئی ایسے دائمی اور ابدی اصول و نظریات اور مستقل اقدار بھی ہیں جن پر

زمانہ اور احوال و ظروف کی تبدیلی اثر انداز نہ ہوتی ہو۔ یا یہ کہ انسان کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہ وہ ہر زمانہ میں اپنے حالات اور ماحول کے مطابق جس طرح چاہے خود زندگی کے اصول و قوانین وضع کرتا پھرے؟

ہم بدیہی طور پر اتنا جانتے ہیں کہ حیاتِ انسانی کائناتِ عالم کا ایک حصہ ہے (محض حصہ ہی نہیں بلکہ جسم کائنات کا عضو نہیں ہے) اور اس حیثیت سے یہ کائنات کی دوسری چیزوں سے بے نیاز نہیں ہے بلکہ ہر چیز سے کسی نہ کسی رنگ میں رابطہ و تعلق رکھتا ہے۔ اور تمام اجزاء عالم کے باہم ربط و تعلق سے کائنات کا نظام قائم ہے۔ جس طرح کہ ایک مشین کے تمام پرزے باہم مدگر مربوط ہوتے ہیں اور ان کے باہم تعاون سے مشین حرکت کرتی ہے۔ اس بنا پر انسانی زندگی سے متعلق جب ہم کچھ سوچنے لگیں گے تو ہماری نگاہ صرف انسان تک ہی محدود نہیں رہے گی، بلکہ کائنات سے اسکو جو نسبت ہے اسکو بہر حال ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ اور اس طرح کائنات کی دوسری چیزوں سے متعلق بحث کرتے وقت انسان کی ہستی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

کائنات کی دوسری چیزوں کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ ان میں کچھ ایسے ازلی وابدی قوانین کارفرما ہیں جو ہمہ وقت مصروف کار رہتے ہیں۔ اور زمانہ یا ماحول ان پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا۔ جب سے انسان پیدا ہوا ہے وہ یہی دیکھتا چلا آیا ہے کہ سورج اور چاند اپنے معمول کے مطابق طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ دن اور رات حسب دستور گھٹتے اور بڑھتے ہیں۔ رات اپنے ساتھ گھٹا لوپ تاریکی لاتی ہے۔ اور دن اپنی ضیا پاشیوں سے پہچانا

جاتا ہے۔ غرض اس طرح کائنات کی ہر چیز نظم اور قانون کی پابند ہے اور اس سے ہم ہی سمجھ سکتے ہیں کہ جو قوانین اس نظام کو چلا رہے ہیں وہ مستقل اور غیر متبدل ہیں۔

(انسان جب اس کائنات کا اہم جزو ہے تو اسکے متعلق ہم یہ کیسے تسلیم کر لیں کہ اسکی زندگی کو ایک ڈھب پر چلانے کے لئے اس طرح کے ازلی اور ابدی قوانین سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ ہمارا شعور نظری اور وجدان اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ جب کائنات کی ہر چیز کو اسکی طبیعت اور فطرت کے مناسب قوانین دیئے گئے ہیں جن سے وہ اپنی ہستی کے تو اذن کو برقرار رکھتی ہے تو انسان کے لئے بھی یقیناً ایسے قوانین کی ضرورت ہے جن سے وہ اپنی زندگی کو ناہمواریوں اور اختلال و فساد سے محفوظ رکھ سکے یا ایک معین رفتار سے زندگی کی ارتقائی حرکت کو جاری رکھ سکے۔)

ہاں! اتنا فرق ضرور ہے کہ انسان کے علاوہ دوسری چیزیں عقل و فہم اور قدرت و اختیار سے محروم ہیں۔ اور وہ مجبور ہیں کہ ان ازلی قوانین کی پابندی کریں۔ لیکن انسان کو صاحب عقل و ہوش اور با اختیار بنایا گیا ہے اور وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی قدرت رکھتا ہے مگر جہاں تک خلاف ورزی کے انجام اور نتائج و عواقب کا تعلق ہے۔ اس میں یہ بھی مجبور و بے بس ہے۔ جب وہ خلاف فطرت اعمال کا ارتکاب کرتا ہے تو اسکو لازماً تباہ کن نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ انسان قوانین کا ایک حصہ ایسا بھی ہے۔

جن میں انسان کی قدرت و اختیار کو دخل نہیں ہے ان میں وہ اسی طرح مجبور ہے جس طرح کہ کائنات کی دوسری چیزیں ہیں۔ مثلاً موت کا طاری ہونا۔ سونے اور جاگنے کی خواہش۔ کھانے پینے کی احتیاج اور اس قسم کے دوسرے امور۔ اس سے بھی یہ بات باسانی سمجھی جاسکتی ہے کہ انسانی زندگی کے دوسرے حصہ (اختیاری حصہ) کے لئے بھی ایسے ابدی اور مستقل اصول و قوانین ہونے چاہئیں جو اسکو صحیح راہ پر چلا سکیں۔

بہر حال انسان اور دیگر اجزاء عالم کے باہم تعلق کی بنا پر قرآن حکیم بار بار انسانوں کو مظاہر کائنات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی نظامِ فلکی کے ہوشربا مناظر اور اسکے حیرت انگیز نظم و تسلسل سے بحث کرتا ہے کبھی عریاح و صحابہ (باد و بادل) کی طبعی اور فطری عجوبہ زایوں کو کمالِ فصاحت و بلاغت سے بیان کرتا ہے۔ کبھی دن اور رات کے تعاقب اور ایک متعین اسلوب سے ان کے گھٹنے بڑھنے کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے۔ اور کبھی عالم نباتات کے غیر متبدل اسلوب ارتقاء کی توضیح کرتا ہے۔ تاکہ انسان ان عناصر کائنات میں غور کرنے سے یہ بات سمجھ لے کہ جس طرح یہ چیزیں ایک متعین اور طے شدہ نظام کے تحت ہر لمحہ رواں دواں رہتی ہیں، اور اس وسیع سلسلہ کائنات کی کسی ایک کڑی میں خلل و فساد رونما ہونے سے نظام کائنات درہم برہم ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے جو دائمی اصول اور مستقل اقدار دی گئی ہیں۔ ان پر چل کر ہی وہ پرامن مسرت بداماں اور متوازن معاشرہ کی تشکیل کر سکتا ہے۔ اور ان اصول و

قوانین سے انحراف کی صورت میں اسکو دائمی شورش، مسلسل اضطراب اور
جاں گسل مصائب و آلام کے جہنم میں ڈھکیل دیا جاتا ہے۔

پس اگر آئے گا تمہارے پاس میری
طرف سے قانون ہدایت تو جس شخص نے
اس قانون کی پیروی کی، اسکو کوئی خوف
نہیں ہے اور نہ وہ غمگین ہوگا۔ اور جن
لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا
ان کو جہنم کا عذاب دیا جائیگا جس میں
فِيهَا خَالِدُونَ

(البقرہ) وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اور قرآن حکیم نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ان اصول و قوانین کو ماننے والوں اور
نہ ماننے والوں سے اس زندگی اور بعد کی زندگی میں ایک ہی جیسا سلوک
نہیں ہوگا۔

أَفَجَعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْجِبْرِيِّينَ
مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ
کیا ہم ماننے والوں اور نہ ماننے والوں
سے ایک ہی سلوک کریں گے۔ تعجب ہے کہ تم
کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

یہاں تک ہم اتنا ہی معلوم کر سکے ہیں کہ حیات انسانی کا توازن قائم رکھنے
اور اسکو صحیح راستہ پر چلانے کے لئے کچھ ابدی اصول و قوانین موجود ہیں۔
لیکن یہ بات ابھی غور طلب ہے کہ ان ابدی اصول و قوانین کو ہم کیسے دریافت
کر سکتے ہیں۔ اور ان کو معلوم کرنے کا ہمارے پاس کون سا ذریعہ ہے؟

بات یہ ہے کہ وہ غیر محسوس قوت جو اس کائنات کی روح ہے اور جس نے نظام عالم کو ایک متعین اور مقررہ نہج و اسلوب پر چلانے کے لئے اصول و قوانین وضع کئے ہیں۔ اسی نے انسانوں کو راہِ عدل پر چلانے اور ضلالت و گمراہی سے بچانے کا اس طرح اہتمام کیا ہے۔ کہ وہ ہر زمانہ میں کچھ پاکیزہ اور معصوم ہستیوں کے ذریعہ انسانوں کو اپنا پیغام سناتی رہی ہے۔ یہ مقدس ہستیاں ہر زمانہ اور ہر ملک میں آتی رہیں اور وہ کمالِ صداقت و دیانت سے پیغامِ رسائی کا فریضہ انجام دیتی رہی ہیں (ہر دوسرے پیغمبر نے وہی کچھ کہا، جو پہلا پیغمبر کہہ گیا تھا۔ یعنی پہلے اور دوسرے پیغمبر کے درمیان اگرچہ کئی صدیوں کا زمانہ حائل تھا۔ مگر جو بات پہلے نبی نے کہی تھی، وہی بات دوسرے نبی نے کہی۔ اور ہر دوسرا نبی پہلے نبی کی تصدیق کرتا رہا یہاں تک کہ ان لوگوں کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچ گئی۔ اور سب سے آخری نبی وہی بات کہتا ہے، جو سب سے پہلے نبی نے کہی تھی۔ اس سے ہر عقلمند انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ بات کسی ایک ہی پرہیزگار شخصیت کی ہے۔ جو ہر زمانہ میں مختلف زبانوں سے سُنی جا رہی ہے۔

اور یہی وہ دائمی اور مستقل اصولِ حیات ہیں جو ان برگزیدہ ہستیوں کے ذریعہ انسانوں کو دینے گئے ہیں۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ
وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (المحید)

بے شک ہم نے اپنے رسول آیتِ بنیات
کے ساتھ بھیجے۔ اور انکے ہمراہ کتاب اور میزان
اتاری تاکہ لوگ راہِ اعتدال پر کھڑے ہو جائیں۔

ان تصریحات کے پیش نظر جب ہم انسانی تمدن کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اسکی تہ میں دو قسم کے تصورات کارفرما نظر آتے ہیں۔ ایک قسم تصورات کی وہ ہے جس کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ اور دوسری قسم ان تصورات کی ہے جو ہر زمانہ میں خود انسان اپنے نفع عاجل اور مفادات جزئیہ کے لئے وضع کرتا چلا آیا ہے۔ قسم اول کے تصورات ازلی اور دوامی ہونے کے علاوہ عالمی اور غیر مبنیت نہ کہتے ہیں۔ اور انکی افادیت زمان و مکان یا کسی خاص انسانی طبقہ سے مخصوص نہیں ہے۔ لہذا ان اصول و تصورات پر جس معاشرہ کی بنیادیں اٹھائی جائیں گی وہ لامحالہ ان تمام خصائص و کمالات کا حامل ہوگا جو کسی صالح اور ارتقائی معاشرہ میں ہونے چاہئیں۔ اس میں ہمہ گیر امن ہوگا۔ اخوت و مساوات ہوگی۔ خوشحالی ہوگی۔ انسانیت کی بے لوث خدمت کا جذبہ ہوگا۔ معاشرہ کے افراد میں باہم تعاون کی بڑی خلوص روح کارفرما ہوگی۔ خصمت و پاکبازمی ہوگی۔ دیانت و صداقت ہوگی۔ اور محبت کی فراوانی ہوگی۔

ایسے معاشرہ کی تعمیر یقیناً وقت طلب اور شدید مشکل ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ انسانیت کی انتہائی منزل یہی ہے۔ اور اسکے سوا مسرت دائمی نہیں۔ مسلسل اور حقیقی فلاح کا حصول کسی شکل میں ممکن نہیں ہے۔ اور قرآن حکیم اسی مقصود انسانیت کو "العاقبہ" یا "الآخرہ" سے تعبیر کرتا ہے۔

دوسری قسم کے تصورات چونکہ مفاد پرستی اور اغراض عاجلہ پر مبنی ہیں۔ اس وجہ سے ان تصورات سے جس معاشرہ کی تعمیر ہوگی، اس میں قدرتی طور پر

بدامنی، شورش و اضطراب، بغض و عناد، وحشت و بہمیت، خود غرضانہ عزائم، مکر و فریب، فسق و معصیت، غصب و نہب، قتل و مفاک، رشوت و بددیانتی اور اس قسم کے تمام مفاسد اجتماعیہ موجود ہونگے۔ قرآن حکیم نے ان تصورات کو "العاجلہ" سے موسوم کیا ہے۔ کَلَّا بَل تَحِبُّونَ

الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ - (کہہ)

پہلی قسم کا انسانی تمدن جو مستقبل اقتدار اور لازمانی تصورات پر مبنی ہے۔ چونکہ عین مقصود انسانیت ہے۔ اور تمام انسانی مطالبات کی تکمیل کرتا ہے۔ اس لئے اسکو لازمی طور پر دوام و استقرار حاصل ہونا چاہئے۔ اور دوسری قسم کا تمدن جو عارضی و وقتی اغرائیں و مہالچ پر مبنی ہے۔ چونکہ شر و فساد کا سرچشمہ ہے اسلئے اسکو کبھی ثبات و استقلال نہیں حاصل ہو سکتا۔

آپ نے غور نہیں کیا کہ اللہ اقلانے نے پائیز کلمہ کی یوں مثال بیان کی ہے۔ کہ وہ پائیز درخت کی طرح ہے جس کی بڑ زمین میں منسوبی سے بڑی ہوئی ہو اور وہی شاخیں بلند ہیں کٹری ہو اور پائیز کے حکم سے ہر حالت میں پھل لاتا ہو اللہ اقلانے اسی طرح انسانوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور ناپاک کلمہ کی مثال ناپاک درخت

الَّذِي تَرَكَتْ حَرْبَ اللَّهِ
مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ
طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا
فِي السَّمَاءِ تُوْتِي أَوْ ثَمَرُهَا كُلُّ
حَيْثُ أَبَازِنِ مَرَامٍ وَأَوْ يَصْرِبُ اللَّهُ
الْأَمْثَالُ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ
وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ
خَبِيثَةٍ خَابِلَةٌ مِنَ النَّارِ

الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ -
يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا
بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ - وَيُعْطِي
اللَّهُ الْمَالِغَا لِمَنْ يَشَاءُ -

سورہ ابراہیم

جیسی ہے۔ جسکو زمین کے اوپر سے اٹھا
دیا جائے۔ اسکے لئے ثبات و قرار نہ ہو۔
اللہ تعالیٰ ثابت قدم رکھتا ہے ایمان والوں
کو قوی ثابت (محکم بات) کے ذریعہ دنیاوی
زندگی اور آخرت میں اور وہ ظالم و غلط کا
لوگوں کو گمراہی کے گڑھے میں پھینکتا ہے۔

پاکیزہ اور صالح زمین کا نہ آمد سبزہ اگاتی ہے۔ جس سے مخلوق خدا کو
فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر ناپاک اور ناقص زمین سے بے کار اور گھٹیا چیزیں نکلتی
ہیں جن سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔

وَالْبَدَأَ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتًا

يَا ذُرِّيَّتِي وَكَانَ الْبَدَأُ كَيْفَ تَكُونُ

لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا - (الاعراف)

اور یہ بات ہمیشہ سے مسلم جلی آتی ہے۔ کہ جو چیز حسن و موزونیت
مضبوطی، استحکام اور افادہ کے جوہر اپنے اندر رکھتی ہے۔ دنیا میں
یقیناً و ثبات اسی کے لئے ہے۔ اور جو ان محاسن سے محروم ہے اسکے
لئے کارگہ عالم میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً

فَسَاءَلَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا

فَأَحْتَسِبُ السَّيْلُ رَبًّا إِسْرَابِيًّا

خدا نے آسمان سے پانی اتارا پس بہنے

لگے نالے اپنے اپنے اندازہ سے پس اکھاٹے

نالہ نے جھاگ ابھرے ہوئے اور اس چیز

د سونے) سے جسکو زیور یا کوئی دوسرا سامان
بنانے کے لئے اک پتلا پہنتے ہیں ایسے ہی جھاگ پختے ہیں
اللہ تعالیٰ احق اور باطل کی اسی طرح مثال
بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ یوں ہی خشک
ہو کر ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور جو چیز لوگوں
کو فائدہ پہنچانے والی ہے وہ زمین
میں باقی رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ
ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ كَرِهَ اللَّهُ
مِثْلَهُ ۚ كَذَلِكَ يُضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ
وَالْبَاطِلَ فَأَمَّا الزُّبُرُ بَدُ فَيَذْهَبُ
جُفَاءً ۚ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ
فَيَمْلِكُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَلِكَ
يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ۔

طرح مثالیں بیان کرتا ہے

(الرعد)

آج دنیا میں صرف ایک ہی انسانی جماعت ان بہرہ
تصویرات اور مستقل اقدار حیات کو ماننے والی ہے

تعمیری انقلاب

جسے قرآن حکیم نے "امت مسلمہ" کا خطاب دیا ہے۔ یہ وہی جماعت ہے
جس نے آج سے تیرہ سو سال قبل انسانی معاشرہ میں حیرت انگیز اور بے مثال
صالح انقلاب پیدا کیا تھا۔ اور ایک جدید نظام تمدن کے قیام و نفاذ سے
دنیا کے انسانیت پر زندگی کی راہیں کھول دی تھیں۔ یہ صالح نظام اجتماع
اگرچہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں
حریت و مساوات کی جو آوازیں گونج رہی ہیں، وہ اسی کی صدا ہے بازگشت
ہیں۔

شہزادہ داستانِ عشق شہزاد انگیز است
آں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

اور عصر حاضر کا انسان اس تابناک مثال کو سامنے رکھ کر ہی آگے کی
 طرف قدم بڑھا سکتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ جماعت جو دنیا کی قیادت
 و امامت اور انسانوں کو نئی زندگی اور نئے تمدن سے روشناس کرانے کے
 لئے مہربان وجود میں آئی تھی آج وہ خود ہی اپنے صحیح مقام کو چھوڑ چکی ہے۔ بلکہ
 وہ اپنے حقیقی مقصد سے اس قدر دور ہٹ چکی ہے کہ اب اس میں اور دوسروں
 میں صرف ظواہر و رسوم ہی سے فرق کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ حقیقت کے اعتبار سے
 ان میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔

چہ گو نمت ز مسلمان نامسلمانے

ہمزایں کہ پور خلیل است آذری داند

آج اسکی اجتماعی سیرت اور ملی تہذیب سراپا بدل چکی ہے۔ اس کے
 عمل و کردار، اسکے اخلاق، اسکی معاشرت اور اسکی معیشت و سیاست
 کو دیکھ کر آج کسی کو یقین ہی نہیں آسکتا کہ یہ وہی ملت ہے جس نے دنیا کے
 انسانیت میں وہ عظیم الشان اخلاقی، سیاسی اور تمدنی انقلاب برپا
 کیا تھا۔ جس کی یاد آج تک اہل دانش و بصیرت کے دلوں میں گروٹیں
 لے رہی ہے۔

سوزِ دل اشکِ رواں آہِ سحرنازِ شب

ایں ہمہ اندہ اثرِ یادِ شامی بیستم

تمدنِ جدید کی صنعت کاریاں بیشک دل فریب اور جاذبِ نظر ہیں
 لیکن حقیقی سکونِ قلب، طمانیتِ خاطر، باہم محبت اور اخوت و مساوت

کے روح پرورد نظارے جو اُس مقدس دور میں دیکھنے والوں نے دیکھے تھے۔ ان کے لئے انسانیت آج تک مضطرب و بے قرار ہے۔ اور عصرِ رواں کی مادی تہذیب جس قدر بڑھتی اور پھیلتی جائیگی، اسی قدر عالمِ انسانی کا اضطراب بڑھتا جائیگا۔

بہر حال اب ضرورت ہے کہ اس جماعتِ راستِ مسلمہ کے فکر و عمل میں نئے سرے سے تبدیلی اور نیا دین کے متعلق اسکے جدا جدا نقطہ ہائے نظر کو یکسر بدل دیا جائے۔ یہاں تک کہ یہ خیال اسکے دل کی عمیق گہرائیوں میں اتر جائے کہ دین کو ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسکو ایک کامل اور ہمہ گیر نظامِ حیات کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ اور زندگی کا کوئی شعبہ اسکی ہدایت و رہنمائی سے محروم نہ ہو۔

در اصل حقیقی یا تعمیری انقلاب کے معنی ہی یہ ہیں کہ انقلاب کے بعد زندگی کا نقطہ نظر ہی بدل جائے۔ مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ انسانوں کے قلب و اذہان سے انقلابی مہم کی ابتدا ہو۔ جب تک دلوں میں صالح انقلاب پیدا نہ ہو اُس وقت تک معاشرہ کی تشکیل کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے طریقِ دعوت و انقلاب کے مطابق ابتدا میں چند مقدس نفوس اور اہل علم و تقویٰ کی تنظیم سے اس کام کا آغاز کیا جائے۔ اور اس جدید ملی تنظیم کے اصول و مبادی بھی اسوۂ نبوت اور منہاجِ منت سے ماخوذ ہوں۔ آئندہ ابواب میں حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ انقلاب اور طریقِ اصلاح و تعمیر اور اس کے

اصول و مبادی سے بحث کی جائیگی۔ لیکن اس سے پہلے ملتِ اسلامیہ کے
 عواملِ فساد سے بحث کرنا ناگزیر ہے۔ کیونکہ دورِ ماضی کے اسبابِ زوال
 پر گہری تنقیدی نگاہ فسادِ امت کے نقطہٴ ابتدا اور نقطہٴ انتہا کی تعیین
 اور دورِ حاضر کی اہم اسلامیہ کے ذہنی انتشار و طوائف الملوکی کے
 تاریخی پس منظر کو سامنے رکھے بغیر تعمیرِ جدید کی کوئی کوشش ثمر بار
 نہیں ہو سکتی۔

اسباب زوالِ اُمت کا عقلی تجزیہ

اسباب زوالِ اُمت کی تشخیص کے سلسلہ میں جن اسباب کا بار بار اعادہ کیا جاتا رہا ہے۔ انکی صحت سے انکار نہیں ہے۔ لیکن انکی تعبیر محدود زاویہ فکر کی پیداوار ہے۔ اور اس مسئلہ پر وسیع تر انسانی نقطہ نظر سے غور کرنا چاہئے۔ کیونکہ مسلمانوں کا جب دعویٰ یہ ہے کہ قرآنی تصورِ زندگی ہمہ گیر اور عالمی حیثیت رکھتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمہ گیر قرآنی تصور کی روشنی میں اس مسئلہ کا تحقیقی جائزہ نہ لیا جائے۔

سب سے پہلے ایک بنیادی مسئلہ کی تیقح ضروری ہے کہ عروج و زوال کے اسباب و عوامل تمام اقوام و ملل کے لئے یکساں ہیں۔ یا ہر قوم کے اسباب عروج و زوال جدا جدا ہیں؟ دوسری صورت بعید از عقل ہے کہ ہر قوم کے لئے الگ الگ قوانینِ فطرت ہوں، بلکہ حکمتِ قرآنی بھی اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ قرآن حکیم سے مفہوم ہوتا ہے کہ کائنات انسانی کا نظام جن اہل اور محکم قوانینِ فطرت پر مبنی ہے۔ وہ قوانین ہر قوم و ملک کے لئے الگ الگ نہیں ہیں۔ فطرت اللہ ایک ہی ہے۔ اور وہ تمام انسانوں کو یکساں طور پر مخاطب کرتی ہے۔

یہ وہی فطری دین ہے جس پر خدا نے
انسانوں کو پیدا کیا۔ اور خدا کی پیدائش
میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی وہ دین محکم ہے
لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

یہ خدائی قانون ہے جو گذشتہ اقوام میں
جاری و ساری رہے۔ اور تم خدائی قانون
میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ
عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِمَنْ خَلَقَ اللَّهُ بِطَرَفٍ
ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِن
أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ - (آیہ)
سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا
مِنْ قَبْلِكُمْ وَلَٰكِنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ
تَبْدِيلًا - (آیہ)

در اصل پوری انسانی تاریخ اسی ”فطرت اللہ“ اور ”سنت اللہ“ کی
عملی تعبیر و تفسیر ہے۔ اور اقوام دنیا کا عروج و زوال ہمیشہ اسی سے
وابستہ رہا ہے۔

فِطْرَةَ اللَّهِ كَمَا نَشَاءُ يَهْدِيهِمْ لِيُؤْتُوا مِنْهُ مِمَّا يَشَاءُونَ
- نہ ہو۔ سب کا ایک ہی مقصد و حیات ہو۔ جس کی جانب وہ بے تابانہ حرکت
کریں۔ اور ان کے عقیدہ و مسلک میں کسی طرح کا اختلاف و تضاد نہ ہو۔
- یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم جب انسانیت کے مشترکہ نصب العین کا ذکر
کرتا ہے تو بلا تخصیص تمام انسانوں کو ”الناس“ کے عام لفظ سے
خطاب کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں اس مضمون کی کئی آیات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے
کہ ابتداء آفرینش میں تمام انسان ”امت واحدہ“ تھے۔ اور ان کا ایک

ہی دستورِ حیات تھا۔ مگر مفاداتِ جزئیہ اور اغراضِ عاجیہ نے ان کو غلط راستے پر ڈال دیا اور وہ کئی فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً
وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ
فِيمَا كَانُوا فَيَخْتَلِفُونَ -

شروع میں تمام انسان قوم واحد تھے
پس انہوں نے اختلاف کیا۔ اگر پہلے سے
یہ بات طے شدہ نہ ہوتی دگر قبول اور غلام
قبول کو خود انسان پر ہی چھوڑ دیا جاتا تو
ان کے اختلاف کا آخری فیصلہ کر دیا جاتا۔

یہ اختلاف چونکہ فطرۃ اللہ کے منشا کے خلاف تھا اس لئے نہدائے قدوس
نے ارسالِ رسل اور انزالِ کتب کا سلسلہ جاری کیا۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً
فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ
وَمُنذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ
الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ
فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ -

وحدتِ انسانی کے ہمہ گیر قرآنی تصور کے پیش نظر یہ دعویٰ یقیناً حق
بجانب ہے کہ انسانیتِ عامہ کی فلاح چند عالمگیر اور محیطِ کل اصولِ فطرت
سے وابستہ ہے۔ جو اقوام ان اصول و قوانین کا احترام کرتی ہیں وہ بہر حال
عزت و وقار کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتی ہیں۔ اور جو قومیں ان قوانین کی
تعمین کرتی ہیں، دنیا کی دولت و رسوائی ان کے حصہ میں آتی ہے۔ اور اس میں

— رنگ و نسل، نام اور مرز و بوم کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ قوانین فطرت وہ محکم اور غیر متزلزل حقائق ہیں جن پر زمان و مکان کا اختلاف اثر انداز نہیں ہوتا اور ہر لمحہ انسانی زندگی ان سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔

اس سے انکار نہیں ہے کہ ہر قوم و ملت کے جداگانہ وجود کے بقا کے لئے کچھ مخصوص عوامل ہوتے ہیں۔ جو محض اس قوم کے خصوصی تشخص پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن عام انسانی قوانین کی نظر میں تمام قومیں یکساں ہیں۔

انسانی زندگی دو بڑے شعبوں میں منقسم ہے۔
قوانین فطرت کا تجزیہ | داخلی اور خارجی۔ یا روحانی اور مادی۔

اول الذکر شعبہ اخلاقی اور مابعد الطبعی قوانین سے متعلق ہے۔ اور دوسرے شعبہ میں مادی اور طبعی قوانین تصرف کرتے ہیں۔ سیاست و معیشت اور معاشرت وغیرہ اسی دوسرے شعبہ کے اجزا ہیں۔ جس طرح مذکورہ داخلی اور خارجی شعبوں کے لئے الگ الگ قوانین ہیں۔ اسی طرح خارجی شعبہ کے مختلف اجزا کے لئے بھی جدا جدا قوانین ہیں۔ یہ تمام قوانین اپنے اپنے دائرہ عمل میں کار فرما رہتے ہیں۔ مگر اس بات سے انکار نہیں ہے۔ کہ جس طرح زندگی کے مختلف شعبے ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اسی طرح ان کے قوانین بھی اگرچہ اولاً وبالذات اپنے اپنے دائرہ عمل میں اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔ لیکن مابعد نتیجہ کے اعتبار سے ایک شعبہ زندگی کے قوانین دوسرے شعبوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور بالآخر ایک شعبہ کا فساد پوری زندگی کے فساد پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے

کئی ایسی اقوام کا ذکر کیا ہے۔ جن کی زندگی میں معیشت کی راہ سے فساد
و اختلال داخل ہوا۔

— و کما اھلکنا من قریۃ
بطرات معیشتہا فتلاک مساکنہم
لم یتسکن من بعد ہم الا
قلیلا۔ (قصص)

بہت سی قومیں جو اپنی معیشت میں حد
اعتدال سے بڑھ گئی تھیں، ہم نے انکو
بلاک کیا۔ پس یہ انکے مکانات ہیں۔ جو
ان کے بعد بہت ہی کم آباد ہو سکے ہیں۔

یہ خیال کہ زندگی کے مختلف اجزا میں الگ الگ قوانین کا رفرما رہتے
ہیں۔ واقعاتی نقطہ نظر سے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر دور میں ایسی
قومیں ملتی ہیں جو سیاسی اعتبار سے محکوم یا پس ماندہ ہوتی ہیں لیکن معاشی
لحاظ سے وہ اقوام عالم کی صف اول میں جگہ پاتی ہیں۔ اور ایسی اقوام بھی
ہوتی ہیں جو سیاسی طور پر آزاد اور خود مختار ہونے کے باوجود معاشی
لحاظ سے دنیا کی پس ماندہ اقوام میں انکا شمار ہوتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ سیاست، معیشت اور دیگر شعبوں کے لئے جدا
جدا قوانین ہیں۔ اور جو قوم کسی ایک ہی شعبہ زندگی کے قوانین پر زیادہ
توجہ دیتی ہے۔ وہ بہر حال اس شعبہ میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتی ہے۔

آج مغربی اقوام اقتدار، سیاست اور ذرائع معیشت کے لحاظ سے
عظیم المثال عظمت و شوکت کی مالک ہیں۔ مگر روحانی فیوض و کمالات اور
اخلاقی برتری سے یکسر تہی دامن ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ ان اقوام نے
صرف مادی حقائق کے فہم و ادراک اور طبعی اکتشافات ہی کو اپنا مطمح نظر

بنایا ہے اور اخلاقی اقدار یا بعداً لطبعی تصورات کو انہوں نے کئی
طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔

شرق حق را دید عالم را نہ دید

غرب را در عالم خرید از حق رمید

یہی وجہ ہے کہ مادہ و جسم کے انتہائی عروج کے باوجود آج تک عالم
انسانی زندگی کی اس حقیقی مسرت سے محروم ہے جسکی خواہش ہر انسان
کے تحت اشعور میں کار فرما ہے۔

قرآنی تصور حیات قرآن حکیم نے انسان کو ایک جامع اور کامل ضابطہ
حیات عطا کیا ہے جو کسی ایک ہی شعبہ زندگی سے

مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ حیات انسانی کے تمام داخلی اور خارجی شعبوں کی
رہنمائی کرتا ہے۔ یعنی وہ مکمل قانون کی حیثیت سے نہ صرف مادہ و جسم کی
ارتقائی حرکت کی نگرانی کرتا ہے۔ بلکہ تطہیر فکر اور تزکیہ نفس کے ذریعہ
انسانی ذہن میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ اسلئے قرآنی تصور زندگی
اور قرآنی ضابطہ حیات کے ذریعہ جس معاشرہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس میں
مادہ و روح، فکر و عمل، دانش و عشق، روح تمدن اور اخلاق و سیرت
کا کچھ ایسا امتزاج ہوتا ہے کہ انسانی زندگی حقیقی طور پر پُر امن پر سکون
اور خوشحال بن جاتی ہے۔ یہی وہ زندگی ہے جس کو قرآن حکیم نے "حیاة
طیبہ" اور "عیشۃ راضیہ" (پاکیزہ زندگی اور خوشگوار زندگی) کے ناموں
سے موسوم کیا ہے۔ اور اسی سے انسان کو مسرتِ دوام اور عیشِ مسلسل

حاصل ہوتی ہے۔ یہ معاشرہ عصر حاضر کے ان تمام ہمالک و خطرات سے پاک ہے جو اقوامِ حاضرہ کی مادہ پرستی اور عقلیتِ محضہ کی وجہ سے عالمِ انسانی پر منڈلا رہے ہیں۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر نہ سکا

عیشِ دوام اور مسرتِ جاودانی کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں ہے
جتنا کہ حیاتِ انسانی کے تمام حقیقی مطالبات کی تکمیل نہ ہو۔ اور ظاہر ہے
کہ حیاتِ انسانی صرف مادہ و جسم کا نام نہیں ہے کہ آج کی اقوام کی طرح
صرف اسی کو مرکزِ توجہ بنا لیا جائے۔ بلکہ اسکے علاوہ زندگی کے کچھ دوسرے
مطالبات ہیں جن کو محض ظن و تخمین سے حل کرنا ممکن نہیں ہے۔

راہبرِ بوطن و تخمین تو نہ بوں کا ر حیات

انسانی زندگی تاریخ کے ہر دور میں حکمتِ قرآنی کی محتاج ہے۔ اور
قرآن حکیم ہر نئے دور کے لئے اپنے پاس تازہ اور تابناک روشنی رکھتا ہے

کہنہ گردو چوں جہاں اندر برشش

می دہد قرآن جہاں نے دیگرشش

چنانچہ خود قرآن حکیم کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام مسائل
کے لئے کامل اور جامع حل پیش کرتا ہے۔ اور زندگی کا کوئی زاویہ اسکی نگاہ سے
اوجھل نہیں ہے۔

قد جاء کرم من اللہ نوراً تمہارے پاس خدا کی عزت سے روشنی

وَكِتَابٍ مُّبِينٍ يُعْهِدِي بِهِ اللَّهُ
 مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ
 وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ
 بِإِذْنِهِ وَيُعْهِدِي لَهُمُ إِلَى
 صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ -

اور کتاب مبین آجکی ہے۔ جو رضاء
 الہی اور امن کی راہ پر چلنا چاہتا ہے۔
 یہ کتاب اسکی رہنمائی کرتی ہے۔ اور انکو
 ظلمت و تاریکی سے نکال کر خدا کے حکم سے
 نور کی طرف لے جاتی ہے۔ اور انکو سیدھی
 راہ پر چلاتی ہے۔

(المائدہ)

ان تصریحات کے پیش نظر علی وجہ البصیرت
 یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم

عروج زوال اقوام اور قرآن

مجموعہ قوانین فطرت ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے مفصل اور جامع
 دستور پیش کرتا ہے۔ یعنی جہاں اس نے سیاست، معیشت اور معاشرت
 کے قوانین تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ وہاں انسان کے داخلی شعبہ کو اسکی
 غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر زیادہ توجہ و التفات کا مستحق قرار دیا ہے۔
 چنانچہ قرآنی انقلاب کا مفہوم کسی ایک ہی شعبہ زندگی کی تبدیلی نہیں ہے۔
 بلکہ پوری زندگی کی تبدیلی ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نزول قرآن سے پہلے دنیا ان قوانین فطرت
 سے نا آشنا تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی پیدائش کے ساتھ ہی
 انسان کو ان بنیادی اصول و قوانین کی تعلیم دی گئی تھی۔ اور تاریخ کے
 ہر دور میں ان کی تجدید ہوتی رہی ہے۔ انبیاء و رسل نے ہر زمانہ میں ان
 قدرتی قوانین کے مجموعہ (دین) کے احیاء کے لئے جدوجہد کی ہے۔ اور

تاریخ کا کوئی دور اس خابطہ حیات کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں سے خالی نہیں رہا۔ ہاں! قرآن کریم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اس قانون کو ایک جامع منضبط اور دوامی شکل عطا کی ہے۔ یعنی قرآنی دستور زندگی ان ہمہ گیر تصورات کے سلسلہ ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ اور زمان و مکان کی تحدید سے آزاد ہے۔

ان هو الا ذکر للعالمین قرآن کریم تمام عالموں کے لئے ذکر ہے
ولتعلمن نبأہ بعد حین۔ اور تم کچھ مدت کے بعد اس حقیقت کو
(آیہ) ضرور جان لو گے۔

ہم گذشتہ صفحات میں ان قوانین فطرت کی نسبت لکھ آئے ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے کچھ جدا جدا قوانین ہیں۔ اور انسانوں کی کوئی جماعت جب کسی ایک ہی شعبہ زندگی کے قوانین پر عمل کرتی ہے۔ تو وہ بہر حال اس شعبہ میں کمال پیدا کر لیتی ہے۔ اگرچہ یہ کمال دوسرے شعبوں کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے عارضی اور ناپائیدار ہوتا ہے۔ اور اسکا انجام یقیناً ہلاکت و بربادی ہے۔

اس اصول کی بنا پر یہ سوال خود بخود ہی حل ہو جاتا ہے کہ آج سیاسی فتنہ اور معاشی برتری کے اعتبار سے غیر مسلم اقوام عروج و اقبال کی بلند چوٹیوں پر کھڑی ہیں۔ اور مسلمان قرآن حکیم کو ماننے ہوئے بھی سیاسی اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اعلیٰ سیاسی اقتدار اور امامت اقوام کے لئے جن

اصول و قوانین کی ضرورت ہے۔ ایک مدت سے مسلمان ان کو چھوڑ چکا ہے
قومی کردار اور ملی سیرت کی بلندی، آہنی عزم، علوم طبعیہ کی مہارت
اور ملی شعور وغیرہ وہ امور ہیں جو کسی قوم کو آسمان سیاست کی بلندی
پر پہنچاتے ہیں۔ اور قرآن حکیم نے ان امور کو متعدد دفعہ ذکر کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا
اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ
(الانفال)

لے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کی
خیانت نہ کرو۔ اور نہ آپس میں ایک
دوسرے کی امانتوں کی خیانت کرو۔

لے ایمان والو! صبر کرو۔ دوسروں
کو صبر کی تلقین کرو۔ اور آپس میں ایک
دوسرے سے بندھ جاؤ۔ اور اللہ سے ڈرو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَابِرُوا
وَرَأِبِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ
تَفْلِحُونَ

تاکہ تم نجات پاسکو۔

آپس میں اختلاف نہ کرو۔ کہ تم کمزور
ہو جاؤ گے۔ اور تمہاری اندرونی طاقت

رآل عمران)
لَا تَنَازِعُوا عُنُقًا فَتَفْشَلُوا وَ
تَذْهَبَ رَأْسُكُمْ

(الانفال) جاتی رہے گی۔

(وغیر ذاکات من الآیات)

اسی طرح کسی قوم کی اقتصادی خوشحالی اور معاشی برتری کے لئے ضروری
ہے کہ اسکے افراد میں مخلصانہ تعامل اور ہمدردانہ تعاون موجود ہو۔ اور وہ
تقسیم دولت کے فطری قانون پر عمل پیرا ہوں۔ نیز ہر شخص ذاتی اور شخصی
خوشحالی سے زیادہ اجتماعی خوشحالی کے لئے سرگرم عمل ہو۔ قرآن کریم نے

ان معاشی اصولوں کو کئی مرتبہ بیان کیا ہے۔

يُحَقِّقُ اللَّهُ الْمَالِ بِأَوْبَرِي

الصَّدَقَاتِ - (البقرہ)

یعنی سود اور اس قسم کے دوسرے کاروباری معاملات جن سے دولت تقسیم ہونے کے بجائے چند اشخاص میں سمٹ جاتی ہے۔ ان سے بالآخر قوم کی معاشی حالت ناہموار ہو جاتی ہے۔ جس سے خطرناک طبقاتی تصادم پیدا ہوتا ہے۔ اور صدقات یعنی سوسائٹی کے پس ماندہ عناصر کو ابھارنے کی کوشش اور تقسیم دولت کے جملہ ذرائع سے مملکت و ریاست کی دولت و خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔

كَيْدًا يَكُونُ دُوكَةً
بَيْتَ الْأَعْيَانِ مَيْكَةً
تاکہ یہ مال دولت مندوں ہی میں نہ چکر کاٹتا رہے۔ (بلکہ غریبا کو بھی انکا حصہ مل سکے)

در اصل سیاست اور معیشت کے ان قوانین میں جو اصل کار فرما ہے وہ قومی شعور، ملی احساس اور پُر خلوص تعاون ہے۔ یہ اجتماعی روح جس شعبہ زندگی میں زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتی ہے اسی تناسب سے یہ شعبہ نمایاں حیثیت پیدا کرتا ہے۔

اسبابِ ذاتیہ اور اضافیہ | اگر سرسری اور سطحی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر قوم بلکہ قوم کے ہر حکمران طبقہ کے

اسبابِ زوال جدا جدا معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کی نگاہیں ان سطحی اسباب پر ہی رُک جاتی ہیں۔ اور اس سے آگے یہ نہیں دیکھتیں

کہ یہ محسوس اور مشہور اسباب خود ہی مؤثر بالذات ہیں۔ یا ان کی تہ میں کوئی دوسرا داعیہ کار فرما ہے جو ان حسی اسباب کے لئے اصل منبع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسی سے ہزار ہا اسبابِ فساد پھوٹتے اور اُبلتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی غلطی ہے جسکی وجہ سے آج تک اصل سببِ مرض کی تشخیص نہیں ہو سکی اور نہ ہی کوئی معقول اور مؤثر علاج تجویز ہو سکا ہے۔

در اصل سب سے پہلے انسانی جماعت کے اسبابِ عروج کا نظری طور پر جائزہ لینا چاہئے۔ کہ انہا اسبابِ عروج کے تعین کے بعد اسبابِ زوال کی تعین میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوگی۔ کیونکہ اسبابِ عروج کی نفی ہی کا دوسرا نام اسبابِ زوال ہے۔

سطور بالا میں لکھا جا چکا ہے کہ چند اصولِ فطرت ہیں جو قوموں کے سیاسی اور معاشی عروج و ارتقاء کا سبب بنتے ہیں۔ ان میں ملی احساس اجتماعی شعور اور جذبہ تعاون و مواسات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن کچھ غائر نظر سے دیکھا جائے تو یہ اسباب بھی مؤثر بالذات یا اسبابِ اولیہ نہیں ہیں۔ اور حقیقی سبب دوسرا ہے۔ جو ان اسباب کی خارجی شکل کرتا ہے۔ وہ حقیقی سبب۔ ایک متعین مقصد کی افادیت کا محکم اور گہرا یقین ہے۔ یہ یقین و اذعان ہی بے پناہ تخلیقی قوت ہے۔ جو بے شمار اضافی اور خارجی امور کو جنم دیتی ہے۔ ان امور میں سے ہر ایک کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے کہ اسکے حصول کے لئے سعی و کوشش کی جاتی ہے۔ اسکو مقصد کہنا چاہئے۔ اور اس لحاظ سے کہ یہ مقصد ما بعد کے لئے

ذریعہ و وسیلہ ہے۔ اسکو سبب کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح یہ تمام امور خارجی ایک حیثیت سے مقاصد ہیں اور دوسری حیثیت سے اسباب! مگر ان میں جو روح کام کرتی ہے وہ اذعان مقصد ہے۔

ماذ تخلیق مقاصد زندہ ایم

از شعاع آرزو تا بندہ ایم

اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ مقصد کیسا ہے۔ کامیابی کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ جس چیز کو آپ مقصد قرار دیتے ہیں اسکی افادیت کا یقین مضبوط اور غیر متزلزل ہو۔ بس یہ یقین محکم ہی آپ کے ظاہر و باطن میں محیر العقول تبدیلی پیدا کرے گا۔ اور آپ کو لذتِ تخلیق سے آشنا کرے گا بلکہ یہ یقین جتنا محکم، مضبوط اور گہرا ہوگا اتنا ہی آپ کی ذات میں جذب و تسخیر کی قوت نمایاں ہوتی جائیگی۔ عزم پختہ اور کردار بلند ہوتا جائے گا۔

یعنی اس کیلئے مقصد کی نوعیت کا سوال نہیں ہے۔ خواہ وہ مقدس اخلاقی نوعیت رکھتا ہو۔ یا خالص مادی ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس مقصد سے آپ کو سچا عشق اور گہری محبت ہو۔ اور آپ اپنی زندگی کی ہر عزیز ترین چیز کو اس مقصد کی خاطر قربان کرنے ہی میں اپنی نجات تصور کرتے ہوں۔ اگر اس قسم کے خلوص کے ساتھ آپ منزل کا عزم رکھتے ہیں تو یقیناً آپ کو قانونِ قدرت کی تائید حاصل ہوگی۔ کَیْسَ لَیْلًا لِنَسَانِ اِلَّا مَا سَعَى اور اگر مقصد کی پُر خلوص محبت سے آپ کا دل خالی ہے تو یہ مقصد خواہ کتنا ہی

مقدس، کتنا ہی بلند اور کتنا ہی ذل فریب کیوں نہ ہو۔ مگر کامیابی کی راہ
آپ کے لئے مسدود رہے گی۔

تاابد بونے محبت بہ مشابہت نہ رسد
ہز کہ خاکِ درینجا نہ بر خسار نہ رفت

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہمیشہ ایسی قومیں موجود رہی ہیں جن کا مقصد
حیات صرف مادی اغراض کا حصول ہوتا ہے۔ مگر چونکہ ان کو اپنے مقصد کی
اقادیت کا گہرا یقین حاصل ہوتا ہے۔ اسوجہ سے وہ ان مادی مقاصد میں
کامیاب ہوتی ہیں۔ مثلاً روس کی کمیونسٹ پارٹی کا مقصد معاشرتی انقلاب
پیدا کرنا ہے۔ اور کچھ دوسری مغربی اقوام "نیشنلزم" پر ایمان رکھتی ہیں
مگر ان اقوام کا اذعان مقصد اس درجہ مضبوط اور محکم ہے۔ بلکہ وہ اس
خالص مادی نصب العین سے اس حد تک لگن رکھتی ہیں کہ اس مقصدی وحدت
نے ان میں پر خلوص جذبہ اخوت غیر متزلزل شعور ملی اور حیرت انگیز قوت
کے دار پیدا کر دی ہے۔ اور ان اوصاف ہی کی وجہ سے آج وہ کامیابی
کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

۔ اسلام نے ملت کے لئے ایک اعلیٰ اور مقدس اخلاقی مقصد متعین کیا

ہے۔ اور اسکے اذعان و یقین کو "ایمان" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

یہی اخلاقی اور الہیاتی رشتہ اقراد ملت کو باہم ملا کر ان کو "بنیان موصول"

بناتا ہے۔ اور ان میں اعلیٰ درجہ کا قومی اخلاق اور اجتماعی کردار پیدا کرتا ہے۔ اور اسی مقصد سے امت کو پُر امن زندگی، اعلیٰ اقتدار اور امامتِ اقوام کا بلند تر مقام حاصل ہوتا ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا
مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَتَّخِذَنَّهُمْ
فِي الْأَرْضِ كَمَا اتَّخَذَ الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ
الَّذِي أَرْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ
مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي
وَلَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا -

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان والوں
اور اچھے کام کرنے والوں سے یہ وعدہ
کیا ہے کہ ان کو زمین میں خلافت کا منصب
عطا کرے گا جیسے وہ پہلی قوموں کو منصب
دیتا رہا ہے۔ اور اس دین کو جسے اس نے
ان کے لئے پسند کیا ہے غلبہ دے گا تاکہ تم ان سے
کرے گا اور ان کے خوف کو امن و بے خوفی
سے بدل دیگا۔

”ایمان“ محض صورت سے عبارت نہیں ہے۔ بلکہ ایک حیران کن قوت موثرہ ہے جو تمام شخصی اور جماعتی اعمال میں انقلابی روح پیدا کرتا ہے۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توجیدی کبھی روشن اس فنو سے اگر قوتِ کردار نہ ہو خود مسلمان سے پوشیدہ مسلمان کا مقام یہاں اس بات کا انہماک بھی از حد ضروری ہے کہ دوسری اقوام اگر جب اپنے مادی مقاصد سے سچا عشق رکھنے کی وجہ سے اعلیٰ سیاسی اقتدار کی حامل ہیں۔ مگر روحانیت و اخلاقیات کے فقدان نے ان کو بے شمار

مفسد و مہالک سے دوچار کر دیا ہے۔ اور اسوجہ سے وہ زندگی کی حقیقی
 مسرت سے محروم ہیں۔ بلکہ ان کی بے پایاں سیاسی طاقت اور معاشی
 برتری خود ان کے لئے وبال جان بن رہی ہے۔ مگر اسلام نے حیات
 انسانی کا جو اعلیٰ اور بلند تر نصب العین متعین کیا ہے۔ وہ ہمہ گیر اور
 محیط کل اخلاقی تصور ہونے کی وجہ سے تمام انسانوں میں پُر خلوص جذبہ
 اخوت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسوجہ سے اس میں ان مفسد
 و خطرات کا کوئی امکان نہیں ہے۔

الذین امنوا ولم یلبسوا
 ایمانہم بظلم اولئک لہم
 الامن و ہم مہتدون۔
 بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں
 نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا
 یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے امن ہے اور وہ
 ہدایت پانے والے ہیں۔
 (الانعام)

ان تصریحات کے بعد اسباب زوال کا تعین کچھ مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ
 جب یہ معلوم ہو گیا کہ عروج اقوام کا نقطہ آغاز متعین مقصد کا اذعان
 محکم ہے۔ تو اس اذعان کا ضعف و اضمحلال زوال اقوام کا سبب اولین
 ہے یعنی تمام خارجی اور محسوس اسباب زوال دراصل اسی سرچشمہ فساد سے
 اُبلتے ہیں۔ اور جس قدر یہ ضعف یقین بڑھتا چلا جاتا ہے، اسی قدر جماعت
 کے قوائے عمل، سیرت و اخلاق اور اجتماعی احساس میں تزلزل، اور
 انتشار پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اعلیٰ صفات کی جگہ ان کی مخالفت قوتیں
 نشوونما پانے لگتی ہیں۔ یعنی ایسی اقوام کے قوائے عمل کمزور ہو جاتے ہیں۔

ملی سیرت پست ہو جاتی ہے۔ اور ان میں جماعتی شعور اور اجتماعی حساسیت کے علی الرغم مخصوص قبیلوی اور خاندانی عصبیت ابھر آتی ہے۔ اور بالآخر یہ خود غرضانہ رجحانات قوم کی ہلاکت و بربادی پر منتج ہوتے ہیں۔ مگر اس تباہی سے پہلے ایک طویل مدت تک اس کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اس کا ہر قدم ہلاکت و بربادی کو دعوت دے رہا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اس مدتِ زوال کے دوران میں دفعتاً پہلی سی شانِ تو انانی عود کر آتی ہے۔ اور قوم کا ہر فرد یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اب قوم از سر نو قوت و اقتدار کی اعلیٰ سطح پر آگئی ہے۔ مگر اسکی یہ خوش فہمی دیر تک قائم نہیں رہتی۔ بالکل اسی طرح کہ بستر مرگ پر لیٹا ہوا مریض ایک عارضی وقفہ کے لئے دفعۃً کچھ افاقہ محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے ضعیف و ناتواں جسم میں کچھ زندگی و قوت کے آثار نمایاں پاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے وہ یہ تصور کر لیتا ہے کہ بس اب میں تندرست ہو گیا ہوں۔ مگر وہ جانتا نہیں کہ طبیعت اور مرض کے باہم مقابلہ کے دوران میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی عارضی سبب سے طبیعت مرض پر غالب آجاتی ہے۔ اور اس عارضی وقفہ کے بعد مرض اس شدت سے حملہ آور ہوتا ہے کہ مریض کو ختم کر دیتا ہے۔

قرآن حکیم نے متعدد مقامات میں اقوامِ ماضیہ کے عروج و زوال کا ذکر کیا ہے۔ اور ان اقوام کے تذکرہ میں جو چیز اساسی درجہ رکھتی ہے وہ شرفِ انسانی کے اعلیٰ نسب العین کا عدم شعور ہے۔ جس نے

ان کی حیاتِ اجتماعیہ میں وہ تمام مفاسد و معائب پیدا کر دیتے تھے، جو قوموں کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنتے ہیں۔

وَكَوَانِ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا
وَ اتَّقُوا فَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ
مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَكِن
كَذَّبُوا فَأَخَذْنَا مِنْهُم بِمَا كَانُوا
يَكْسِبُونَ -

اگر یہ بسنیوں والے (جن کا ذکر پیچھے
گذر چکا ہے) ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار
کرتے تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین
کی برکتیں کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے
تکذیب کی۔ پس ہم نے ان کو انکے اعمال
کی وجہ سے بتلائے عذاب کیا۔

(الاعراف)

چونکہ مقصد حیات کا عدم شعور اور نفی یقین ہی تمام مفاسدِ اجتماعیہ کا سرچشمہ ہے۔ اسلئے خدا کے قدوس نے نہایت بلیغ اور موثر انداز میں مسلمانوں کو اس سرچشمہ ضلالت سے مجتنب رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔

کیا مسلمانوں کے لئے وہ وقت نہیں
آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور اسکے
پیغام کے لئے جھک جائیں؟ اور انکی طرح
نہ ہو جائیں جنکو اس سے پہلے کتاب دی
گئی تھی۔ پس ان پر ایک طویل نرصہ گذرا۔
اور ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں

الَّذِينَ آمَنُوا
أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ
وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا
كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ
فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ
قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ -

سے بہت لوگ نافرمان ہیں۔

(حدید)

یہاں تک عمومی نقطہ نظر سے اسبابِ زوالِ اہم پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ ترکِ قرآن اور زوالِ اُمت میں عقلی اور منطقی طور پر کیا تعلق ہے؟ مگر اس بحث سے چند نہایت دقیق اور اہم مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

- (۱) تاریخی اعتبار سے زوالِ اُمت کا نقطہ آغاز کیا ہے
- (۲) تاریخ کے ہر دور میں کس کس راستہ سے مسلمانوں کے نظامِ حیات اور شیرازہ ملی میں فساد داخل ہوا۔
- (۳) اسبابِ فساد کے لحاظ سے آج ملتِ اسلامیہ کس جگہ پر کھڑی ہے۔

ہم آئندہ صفحات میں ان مسائل سے بحث کریں گے۔

تاریخ زوالِ امت کا حقیقی جائزہ

یوں تو ہر قوم کی تاریخ اپنے اندر کوئی نہ کوئی خصوصیت رکھتی ہے۔ لیکن امت مسلمہ کے مدوجزرا اور نشیب و فراز کی داستان کچھ ایسی مجموعہ اصداد ہے کہ انسان اسکے تحقیقی مطالعہ کے بعد حیرت و استعجاب کے بحر عمیق میں غرق ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اسکی تیزروا اٹھان اور حیرت انگیز رفتار ترقی کی جانب نگاہ اٹھائیگی تو اقوام دنیا کی تمام رفعتیں اسکے آگے پست نظر آئیں گی۔ اور اگر اسکے دورِ تنزل کی بوالعجبیوں کا نظارہ کریں گے تو اس میں بھی آپ کو عجیب و غریب منظر دکھائی دے گا۔

حدیث درود لآویزہ داستانے بہت

کہ ذوق بیش دہد چو دراز تر گر و د!

یہ عجیب بات ہے کہ دوسری قومیں ایک دفعہ اپنی شانِ جبروت اور نظارہ سطوت و شوکت دکھا کر اس طرح روپوش ہو گئیں کہ آج ان کے آثار ہی سے ان کے تاریخی وجود کی شہادت ملے تو ملے لیکن خود ان کا وجود ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے مٹ چکا ہے۔

و کم اهلکنا من قریة بہت سی قومیں جو اپنی معیشت میں جا

بطرات معیشتہا فتلك مسافر کنہر
 لہر تسکن من بعد ہر الاقلیلا
 وکنا نحن الواسرین -
 بہت ہی کم آباد ہوئے ہیں۔ (اور اصل وارث
 تو ہم ہی ہیں۔) (قصص)

اہل یونان کی عظمت و شوکت قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ ساسانیوں
 کی سطوت کا آج کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ اہل مصر کا جاہ و جلال اس
 طرح رخصت ہوا کہ آج اسکی داستان سرائی سے دنیا لطف اندوز
 ہوتی ہے۔ عمار و ثمود اور سب جیسی طاقتور قومیں دنیا میں آئیں، اور
 اپنی بے پایاں قوت و شوکت کا ایک ڈراما منظر دکھا کر ہمیشہ کے لئے
 رخصت ہو گئیں اور سردارانِ مکہ کا غرور و پندار قلبِ بدر کی پہنائیوں
 میں دفن ہو گیا۔

و استوجعت من بنی ساسان ما وہبت

ولم تدع لینی یونان من اشر

ومزقت سباً فی کل ناحیۃ

فما التقی راخ منہم بمستکبر

ویوحہ القلب بنو بدر فنا و سعی

قلیب بدر بمن فیہ الی سقر

(ابن عبدون اندلسی)

یہ زمانہ نے ساسانیوں کو جو کچھ بخشا تھا وہ سب اپنے لیا۔ اور اہل یونان کی کوئی نشانی باقی نہ رہی،
 مکہ اہل سب کے ملک کے ہر گوشہ میں لکڑے اڑا دیے۔ کسی صبح کرنے والے کو ان کی ہوا بھی نہ پہنچ سکی۔
 مکہ بدر کے دن اہل بدر (قریش) فنا ہو گئے۔ (اور قلبِ بدر (کنواں) انکو ساتھ لیکر جہنم میں چلا گیا۔)

مگر امتِ مسلمہ کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ کہ اس کو ہزاروں دفعہ طوفانِ حوادث سے ٹکرانا پڑا۔ بارہا اسکے خون کے دریا بہائے گئے اور دنیا کی تمام قوموں نے متحدہ محاذ بنا کر اسکو مٹانے کے لئے ایڑی جوٹی کا زور لگایا۔ مگر کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ جو قومیں اس کو ختم کرنے کے لئے آگے بڑھیں وہ یا تو خود ختم ہو گئیں۔ اور یا ان کو اسلام کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔

تو نخلِ خوش ثمرے کیسی کہ باغِ وحش

ہمہ ز خویش بریدند با تو پیوستند

اہلِ روم نے اس نوزائیدہ ملت کے مٹانے میں کون سی کسر اٹھا رکھی تھی۔ ایران کے آتش پرستوں نے گلشنِ اسلام کی بہار نو کو خاکستر بنانے میں کونسا دقیقہ فرود گذاشت کیا تھا۔ اور تاتاریوں کے سپلا ب بلا انگیز کی طغیانی کس طرح عباسیوں کی عظمت و شوکت کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی تھی؟ یہاں تک کہ دنیا کو یقین ہو گیا تھا کہ اب مسلمان قوم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگی، مگر ہوا کیا؟ رومیوں اور ساسانیوں کی حکومتیں اس طرح مٹ گئیں کہ انکی عظمت و شوکت کی صرف یاد ہی دلوں میں باقی رہ گئی ہے، اور تاتاریوں کا شعلہ سوزاں امتِ مسلمہ کی دستارِ عظمت کا خوشنما پھول بن گیا۔

آتشِ تاتاریاں گلزارِ کیت؟ شعلہ ہائے اوگل دستارِ کیت؟

از تہ آتش بر اندازیم گل نار ہر نمودر اسازیم گل

رومیاں را گرم بازاری مانند
شیشہ سا سا نیادریخوں نشست
آں جہانگیری جہانداری مانند
رونق نمنخانہ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوان او تہہ اہرام ماند
در جہاں بانگ اذان بدست و
ملت اسلامیاں بود دست و بہت
عشق از سوز دل مادنہ دست
از شرار لاله تابندہ دست
گرچہ مثل غنچہ د لگیریم ما
گلستاں میرداگر میریم ما

امت مسلمہ کی تاریخ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دوسری اقوام جب
دوبہ تنزل ہونے لگتی ہیں تو ان کے تمام فرقے اور افراد یکساں طور پر
ذہنی انحطاط کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں اہل حق کی کوئی جماعت
یا فوق العادت انقلابی شخصیت باقی نہیں رہتی۔ مگر تاریخ اسلامی کا ایک
نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہاں اگر ایک طرف خود غرض، جاہ پسند اور غداران
ملت کی جماعت کے ہاتھوں ملت کی بیخ کنی کے سامان ہو رہے ہوتے ہیں
تو دوسری طرف پرستار ان حق کی کوئی جماعت یا انقلابی شخصیت بر وقت
سامنے آجاتی ہے۔ جو مسلمانوں کی ڈگمگاتی کشتی کو ساحل مراد تک لے
جاتی ہے۔ اور اس طرح آنے والی تباہی ایسے مقدس اشخاص کی فوق العاد
قوتوں کے ذریعہ ٹل جاتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلامی کے ہر دور میں یہی کچھ ہوتا
رہا ہے۔ اور اسکی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدائے قدوس ملت اسلامیہ
کو تا قیام قیامت باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اور اسی کے ہاتھ سے عالم انسانی میں
ہمہ گیر فکری اور اخلاقی انقلاب بپا کرنا چاہتا ہے۔

- هو الذی ارسل رسوله
 بالهدی و دین الحق لیظہرہ
 علی الدین کلہ -
 خدا کی وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول
 کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ
 یہ دین تمام ادیان پر غالب آجائے۔

ہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ شیوہ آذری اور سنت ابراہیمی
 کا عجیب و غریب اتزاج ہے۔ جب بھی اس امت میں کوئی بت گر اور بت فروش
 پیدا ہوا خدائے وحدہ لا شریک نے فوراً کسی بت شکن کو بھیج دیا جس نے
 حق کی ضربتِ کاری سے بتانِ باطل کے پرزے اڑا دیئے۔
 پاش پاش از ضربتِش لات و منات

بہر حال اس حقیقت سے اغماض نہیں کیا جاسکتا کہ جس طرح ملت
 اسلامی کا دور ارتقاء اپنے اندر چند در چند خصوصیات رکھتا ہے۔ اسی طرح
 اس کا دور زوال بھی اپنی مثال آپ ہے۔ چنانچہ اسکے دور انحطاط میں اگر
 خود غرض اور ملت فروش عناصر کی بہتات نظر آتی ہے۔ تو اہل حق کی صدا
 عشق بھی ہر زمانہ میں اپنی انقلابی روح کے ساتھ کار فرما رہی ہے۔

از صدائے سخن عشق نہ ویدم خوشتر

یا دو گارے کہ دریں گنبد و وارہ ماند

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ خود باقی ملت علیہ التحیۃ والسلام نے واضح
 الفاظ میں فرما دیا ہے۔

میری امت میں ہمیشہ ایک ایسا گروہ

لا تزال من امتی امة یقاومون

رہیگا جو حق کی حفاظت کے لئے رٹتا رہیگا۔

علی الحق۔ (آخر جہ ابو داؤد)

حقیقت میں اس امت کے بقا و دوام کا یہی ایک راز ہے۔ ورنہ اسکی اپنی بد اعمالیوں اور خود فراموشیوں کی جگہ سوز و داستان کو سامنے رکھا جائے اور پھر اُن دشمنان ملت کے عزائم کا جائزہ لیا جائے جو ہر دور میں ملتِ اسلامی کے خلاف نبردِ ازار ہے ہیں تو اس کا صفحہ ہستی پر باقی رہنا ناممکن تھا۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسلامیوں کو جس مقصد کے اٹھایا گیا تھا اسکے پیش نظر ان کا محض وجود و بقا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس مقصد کے حصول کے لئے قوی تر، غالب تر، اور موثر تر وجود کی ضرورت ہے جو اپنی سریع الاثر قوتِ نفوذ سے انسانی دنیا میں مخصوص طرز کا اخلاقی اور روحانی انقلاب برپا کر سکے۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً
وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى
النَّاسِ وَيَكُونَ النَّاسُ لَكُمْ
شُهَدَاءَ ۗ

اور اسی طرف ہم نے تم کو متوسط امت
بنایا ہے۔ تاکہ تم لوگوں پر گواہ اور
نگراں بنو اور رسولوں کو تم پر گواہ اور
نگراں بنیں۔

”امت و وسطا“ کے لفظ میں اس امر کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ امت مسلمہ کو انسانی دنیا میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جس طرح دائرہ کا وجود و بقا اپنے محور کے وجود پر انحصار رکھتا ہے۔ اسی طرح عالم انسانی کا وجود و بقا امتِ اسلامیہ کے وجود کا محتاج ہے۔

گلستاں میرداگر میریم ما
اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ وجود موثر امتِ مسلمہ سے کس طرح چھٹنا اور اسکے

اسباب و دوا کی کیا ہیں؟ اور اب اگر اسکے وجود کو موثر بنانا مقصود ہے۔ تو اسکے لئے کونسا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔ اسی نقطہ نظر سے ہم اسلامی تاریخ کا جائزہ لیں گے۔

ملتِ اسلامیہ کا تعمیری اور ارتقائی دور | فطرتِ انسانی میں خیر اور شر کی متضاد قوتیں ودیعت رکھدی گئی

ہیں۔ اسلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک قوت کلیتہً فنا ہو جائے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی مخصوص فطری صلاحیت ماحول کے طبعی اقتضا یا کسی فوق العادت شخصیت کے مجزا ذہن طرز اصلاح و تعمیر سے اپنے قلب و نظر کی نیک صلاحیتوں کو اس قدر موثر بنائے کہ قوتِ شر کے پھیلاؤ کی تمام روئیں بند ہو جائیں۔ اور وہ گو شر عافیت میں سمٹ کر رہ جائے۔

اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قوتِ شر، شخصی استعداد اور ماحول کی مدد سے قوتِ خیر کو بے اثر بنا دے۔ مگر کسی ایک قوت کے غلبہ و استیلا کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اسکی مخالف قوت بالکل معدوم ہو جاتی ہے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ قوت مغلوبہ حالات کی نظر رہتی ہے۔ اور جب بھی کہیں قوتِ غالبہ کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگتی ہے۔ تو یہ جھٹ اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔

مگر یہ بات ناقابل انکار ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ہدایت و ارشاد کا جو اعلیٰ منصب ذاتِ خداوندی کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ اسکا قدرتی

اقتضایہ ہے کہ انکی زندگی از اول تا آخر ہے داغ اور معصوم ہوتی ہے۔ انکے
 تو اے خیر کو ہر وقت پر وہ غیب سے مدد ملتی ہے۔ اور قوائے شر کو کبھی ابھرنے
 کا موقع نہیں مل سکتا۔ اسلئے مقام نبوت متذکرہ بالاکلیہ سے مستثنیٰ ہے
 اور نبی کے سوا کسی دوسری شخصیت کے متعلق ہرگز یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا
 کہ وہ ہر نقص و خطا سے محفوظ ہے۔ ہاں دوسرے لوگوں میں مراتب و مدارج
 کا اختلاف ہو سکتا ہے۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو دوسروں
 کی نسبت بہت زیادہ ہوائے نفس پر غلبہ و اقتدار رکھتے ہیں اور ان سے
 بہت ہی کم نغزش سرزد ہوتی ہے۔ اس فرعی تہید کے بعد اسلام
 کے مختلف ادوار پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ خیر اور شر کی کشمکش یا نصب العین
 کے اذعان و یقین کی شدت اور ضعف سے ہر دور میں کیا کیا نتائج مرتب
 ہوتے رہے ہیں۔

دور رسالت خیر اور شر کی تمیز ایک ذہنی عمل ہے۔ اور اسکے لئے
 ایک خاص قسم کی بصیرت کی ضرورت ہے جو مقصد حیات
 کی راہ میں پیش آنے والے امور کی تجرید کرتی ہے۔ اور ان پر خیر یا شر کا حکم
 لگاتی ہے۔ اور جن لوگوں کا کوئی مقصد ہی نہ ہو ان کے نزدیک خیر اور شر
 کی تمیز بے معنی چیز ہے۔

سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے عالم انسانی ہر گیر
 ذہنی انتشار اور لامقصدیت میں مبتلا تھا۔ پوری کائنات انسانی میں
 زندگی کا پاکیزہ اور واضح تصور رکھنے والی کوئی قوم بھی موجود نہ تھی۔ اس

دور کے انسانوں کا تصور حیات قبیلہ و نسب کی روایتی عظمت و شرافت،
 فاندانی و جاہت اور قومی برتری کے سوا کچھ نہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس
 بہیمانہ تصور کو انسانیت کا مقصد نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بلکہ حقیقت میں یہ
 انسانی مقصد حیات کی ضد ہے جس سے خطرناک انتشار و لامرکزیت کی بنا
 پھوٹتی ہے۔ کیونکہ جب انسانی جماعت کے سامنے کوئی وسیع تر اور ہمہ گیر
 تصور حیات نہ ہو۔ اور ہر انسانی گروہ جدا جدا مقصد زندگی رکھتا ہو۔ تو
 اس صورت میں ان کے مفادات جزئیہ اور اغراض فاسدہ کا بار ہم تھا و ہم ناگزیر
 ہو جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بشت نبوی سے قبل دنیا کی تمام قوموں کی
 بالکل یہی کیفیت تھی۔ ہر گروہ انسانی ہر قبیلہ خاندان۔ بلکہ ہر ایک فرد انسانی
 کا جدا جدا نظریہ حیات تھا۔ اور ان میں کسی طرح کا مقصدی اتحاد و شراک
 نہ تھا۔ یہی وہ ہلاکت آفریں انسانی دور تھا۔ جس کی نسبت قرآن حکیم نے
 ارشاد فرمایا ہے

اور تم آگ کے گڑھے کے کنارہ پر کھڑے
 تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے بچایا۔
 اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی آیات بیان کرتا
 ہے تاکہ تم ہدایت کو پاسکو۔

وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرٍ مِّنْهُ
 مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُم مِّنْهَا
 كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ
 لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ (البقرہ)

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہمہ گیر ذہنی لامرکزیت اور معاشرتی
 طوائف الملکی کے پرخطر دور میں دنیا کے انسانوں کو ایک بلند تر وسیع تر
 اور مقدس مقصد حیات عطا کیا۔ یہ مقصد حیات کیا ہے؟ ایک ایسی

پُر مسرت اور پُر امن زندگی کا حصول ہے۔ جو دائم اور مسلسل ہے۔ اور اسکا ایک سرا اعماقِ قلوبِ انسانی میں پیوست ہے اور دوسرا اُس ذاتِ ابدی سے جا ملتا ہے۔ جو کائنات کی اصل اور محسوسات سے ورار اور ہی ہے۔ یعنی انسان اور ذاتِ خداوندی کا پُر اسرار اور گہرا تعلق ہی حیاتِ انسانی کو جاوہِ اعتدال پر قائم رکھ سکتا ہے۔ اسی سے دنیا کے تمام انسان ایک ہی رشتہٴ اخوت میں منسلک ہو سکتے ہیں۔ اور اسی سے انسانیت کو غیشِ جاوداں اور مسرتِ ابدی حاصل ہوتی ہے۔

سر غیشِ جاوداں خواہی بیا

ہم زمیں ہم آسماں اہی بیا

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس الہیاتی تصور کی بنیادوں پر ایک جدید ملت تعمیر فرمائی۔ اس ملت میں شامل ہونے والے ہر فرد سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ وہ اپنی پوری زندگی خدا اور اس کے دین کے حوالے کر گیا۔ اس کا سرِ نیا۔ رب العالمین کے سوا کسی دوسرے کے آگے ہرگز نہیں جھکے گا۔ بتانِ رنگ و نسل سے منحرف ہو کر صرف اللہ سے پیمانِ محبت و عقیدت استوار رکھے گا۔ اس کا عہد و فاداری کسی مخلوق کے لئے نہیں بلکہ صرف احکم الحاکمین کے لئے ہوگا۔ وہ اپنے تمام شخصی نسلی اور وطنی مفادات کو دینی اور ملی مفاد کی خاطر قربان کرے گا۔ اور اسکی پوری زندگی اس اعلیٰ و برتر مقصد کے لئے وقف ہوگی۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَحَيَاتِي وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

لَا شَرِيكَ لَكَ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ (آیہ)
 اے نبی آپ لوگوں سے کہہ دیں کہ میری نماز، میری قربانی، میری
 زندگی، میری موت، صرف خدائے لاشریک کے لئے ہے۔ مجھے
 اسی بات کا حکم دیا گیا ہے۔ اور میں پہلا مسلمان ہوں۔“

تابع حق دیدنش ناودیدنش
 خوردنش نوزیدنش خوا بیدنش

تاجدار و عالم صلعم کا یہ پُر اسرار معجزہ تھا کہ جو شخص اس یقین و اقرار
 کے ساتھ ملت میں آجاتا وہ فی الواقع اپنے اندر یہ اعلیٰ اور مقدس صفات
 پیدا کر لیتا تھا۔ یعنی وہ اپنے تئیں اس طرح جماعت میں گم کر دیتا تھا کہ گویا
 ملت کے اجتماعی مفاد اور اقامت دین کے سوا اسکے سامنے کوئی مقصد
 ہی نہیں ہے۔ اسکی زبان صرف حق کے لئے کھلتی تھی۔ اس کا ہر قدم اعلیٰ کلمۃ الحق
 کے لئے اٹھتا تھا۔ اور اسکی تلوار صرف تحفظ دین کے لئے میان سے باہر
 آتی تھی۔ یعنی ان کی جدوجہد قبیلہ و نسب کی عظمت کے لئے نہیں بلکہ دین
 اور محض دین کی سر بلندی کے لئے وقف تھی۔ دینی اخوت نے ان میں ایسا
 نظم اور ڈسپلن پیدا کر دیا تھا کہ وہ جس طرف رخ کرتے تھے، فتح و نصرت
 انکی قدم بوسی کرتی تھی۔ اب انکے سامنے ایک واضح اور غیر مبہم نصب العین
 تھا اور اس نصب العین سے ان کو اس درجہ عقیدت و محبت تھی کہ وہ
 اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع کو اس پر قربان کرنے ہی میں اپنی نجات تصور
 کرتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا عدیم المثال عروج و اقبال اسی

یقین محکم اور مقصد حیات کی گہری عقیدت کا رہیں منت تھا۔

مٹتے چوں می شود توحید مست قوت و جبروت می آید بدست

فردا از توحید لاہوتی شود ملت از توحید جبروتی شود

ہر دو از توحید می گیرد کماں زندگی این را جلال آزا جمال

جب تک صاحب رسالت علیہ التحیۃ والسلام ان میں موجود ہے
ان کی جدوجہد کا مرکز صرف یہی بلند تر اخلاقی مقصد رہا۔ ہوائے نفس، ذاتی
اعراض قبیلری اور خاندانی عصبیت ان کے یقین محکم کے سامنے مرنے
اٹھا سکی۔

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ انسان (باستثنائے انبیاء علیہم السلام) خواہ
کتنا ہی بلند نظر اور دانش افکر کیوں نہ ہو۔ مگر مفاد ذاتی اس کا پھیلا نہیں
چھوڑتا۔ اور زندگی میں کوئی وقت ایسا آہی جاتا ہے کہ اس کا جذبہ منفعت
ذات، حمیت دینی یا مفاد ملی پر غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ زمانہ رسالت
میں بھی اسکی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

غزوہ بدر میں جب مسلمانوں کو کفار مکہ کے مقابلہ میں عظیم الشان فتح
نصیب ہوئی اور تقسیم غنائم کا وقت آیا تو کچھ نوجوانوں نے یہ کہہ دیا کہ
رٹنے اور مرنے کے لئے ہم سب سے آگے ہوں اور اموال غنائم میں بدبختوں
کو مساوی حصہ کیوں دیا جائے؟ اس موقع پر کچھ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اموال غنیمت کے نسبت سوال کیا۔ اس پر سورہ انفال کی ابتدائی آیتیں
نازل ہوئیں۔ ان آیات میں جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اموال غنیمت

کا اصل مالک و متصرف کون ہے۔ وہاں مسلمانوں کو ان کی ہوسناکیوں پر لطیف پیرایہ میں ڈانٹ دی ہے۔ اور ان کو قلب و نظر کی اصلاح کی جانب متوجہ کیا ہے۔ اور پھر بندۂ مومن کی وہ صفات ذکر کی گئی ہیں جن سے ان کے مقصدِ اعلیٰ کا انکشاف ہوتا ہے۔

آپ سے اموالِ غنیمت کی نسبت پوچھتے ہیں۔ آپ ان سے کہیں کہ یہ اموالِ اللہ اور رسول کے لئے ہیں۔ پس تم اللہ سے ڈرو۔ اور اپنے معاملاتِ باہمی (اجتماعی سیر) کی اصلاح کرو۔ اور خدا و رسول کی اطاعت کرو۔ اگر تم سچے مومن ہو۔ بجز اسکے نہیں کہ مومن وہ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جائے تو انکے دل ڈرنے لگیں۔ اور جب اسکی آیات ان پر پڑھی جائیں تو ان کے ایمان کو بڑھادیں۔ اور وہ اللہ پر توکل کرتے ہوں وہ جو نماز قائم کرتے ہیں۔ اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقت میں سچے مومن ہیں انکے لئے اپنے رب کے ہاں بہت درجے ہیں۔ مغفرت ہے۔ اور باوقار معیشت ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَمْرًا بَيْنَكُمْ وَالْطَّيِّبُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا دُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ - الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ - أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ (الأنفال)

آپ نے دیکھا؟ کہ ان آیات میں چند مسلمانوں کی معمولی سی لغزش کو اِزْوَاجِ حَال کی نظر میں معمولی ہے ورنہ حقیقت میں معمولی نہیں ہے، ایمان کے منافی تصور کیا گیا ہے۔ اور اشاروں میں یہ بتا دیا کہ مومن کی یہ شان نہیں ہے۔ جو ابھی ابھی تم نے دکھائی ہے۔ مومن اور زہد و مال کی ہوس؟ یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ یاد رکھو کہ تم ابھی شیدہ عاشقی میں پختہ کار نہیں بن سکے ہو۔ حریص و لالچ کے بت اب بھی تم نے اپنے دلوں کی پہنائیوں میں چھپا رکھے ہیں۔ اب ان بتوں کو توڑنا ہوگا۔ اور قلب و نظر کی اصلاح کرنی ہوگی۔

باشش مانتا خلیل اللہ مست ہر کہن بتخانہ را باید شکست
 مومن از عزم و توکل قاہر است گردار و این دو جو ہر کافر است
 غرورہ احد میں جو افسوس ناک واقعہ پیش آیا قرآن حکیم نے اسکو حسین
 و یلیغ انداز میں ذکر کیا ہے۔ اور مسلمانوں کے نقصانِ عظیم کی ذمہ داری ان
 لوگوں پر عائد کی ہے جن کو آنحضرت صلعم نے ایک خاص مقام پر متعین فرمایا
 تھا۔ اور انہوں نے عنیت کے شوق میں آپ کے حکم کی خلافت و رزمی
 کی تھی۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے سچا کر دکھایا اپنا
 وعدہ جبکہ تم دشمنوں کو کاٹ رہے تھے۔
 اسکے حکم سے یہاں تک کہ جب تم نے کفر کی
 دکھائی۔ امر رسول میں جھگڑا کیا۔ اور فری
 ک تم نے اسکے بعد کہ اللہ تعالیٰ تم کو وہ

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ
 إِذْ حَسِبْتُمْ أَنَّكُمْ بِالْحِمْيَرِ
 فَسَلَّمْتُمْ نَائِرَ عَتَمِ فِي الْآخِرِ
 وَعَصَيْتُمْ مِمَّنْ بَعْدَ مَا آرَأَكُمْ
 مَا تُحِبُّونَ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا

وَمِنْكُمْ مِنْ بَرِيدِ الْآخِرَةِ . ثُمَّ
 صَرْفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ
 عَفَا اللَّهُ عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ
 عَلَى الْعَالَمِينَ۔

چیز دیکھا دہی تھی، جسکی تم خواہش رکھتے
 تھے۔ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کی خواہش کرنے
 لگے اور کچھ آخرت کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے
 تمکو کفار سے ہٹا لیا تاکہ تمہارا اسمان کرے
 پھر اللہ تعالیٰ نے تمہاری لغزش کو معاف کیا
 اور اللہ تعالیٰ جہان والوں پر فضل کرے گا۔

(آل عمران)

غزوہ بنی المصطلق میں ایک مہاجر اور انصاری کسی بات پر لڑ پڑے۔ مہاجر
 انصاری کو پیٹا۔ اس پر انصاری نے مدد طلب کی اور مہاجرین نے مہاجرین کو پکارا آنحضرت
 صلعم نے یا لای انصار اور یا لہم ہاجرین کی آواز سنی تو فرمایا۔ عابال دعویٰ جاہلیتہ، یہ جاہلیت کی
 پکار کیا ہے؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو پیٹا ہے۔ اس پر آنحضرت صلعم نے فرمایا۔
 دعویٰ جاہلیتہ (بخاری) اس غزوہ کو چھوڑ دو کہ یہ ناپاک غزوہ ہے
 غزوہ حنین میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا آنحضرت صلعم نے کچھ
 تو مسلموں کو اموال غنیمت سے زیادہ حصہ دیا۔ اس پر انصار کے کچھ
 لو جو انوں نے کہہ دیا۔

اِنَّ سَيُوقَاتِلُنَا لِقَطْرِ مِنْ دِمَاءِ
 قُرَيْشٍ وَغَنَائِمًا تَرُدُّ عَلَيْهِمْ
 ہماری تلواروں سے اب تک قریش کا خون
 ٹپک رہا ہے۔ اور اب ہمارا حصہ بھی انکو
 دیا جا رہا ہے۔ (بخاری)

آنحضرت صلعم نے جب یہ بات سنی تو آپ نے انصار کو بلایا۔ اور ان کے
 دریافت فرمایا کہ تم نے یہ بات کہی ہے؟ انصار نے شرم و ندامت کے

اہم میں عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے جو کچھ سنا ہے۔ وہ صحیح ہے۔ لیکن ہم
میں سے چند نوجوانوں نے یہ بات کہی ہے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے ایک پر جوش خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس سے انصار پر ایک رقت کا عالم طاری
ہو گیا اور وہ مارے شرم کے سراو بچانہ کر سکتے تھے۔

مدینہ منورہ میں بھی ایک دو دفعہ اس قسم کا واقعہ پیش آیا۔ مگر عہد رسالت
کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ ایسے مواقع پر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی
مقدس شخصیت اڑے آجاتی تھی۔ اور آپ کی نگاہ انقلاب آفرین گدلوں
کی دنیا ہی بدل جاتی تھی۔

دل میں سماگئی ہیں قیامت کی شوخیاں

دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے یہ عارضی نفرت و کدورت چند لمحوں
ہی میں محبت و اخوت میں بدل جاتی تھی۔ اور یہ بات اس عظیم الشان
ہستی کے لئے کچھ مشکل نہ تھی۔ جس نے صدیوں کی عداوتیں چند دنوں ہی
میں ختم کر دی تھیں۔ اور ان میں دینی مواخات کا ایک وسیع تر اور محکم تر
رشتہ قائم کر دیا تھا۔ بنا بریں زمانہ رسالت ملت اسلامیہ کا خالص تعمیری
اور ارتقائی دور تھا۔ اور اس دور میں ملت اسلامیہ ہر قسم کے تخریبی
رجحانات سے پاک تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تین
عہد خلافت شدہ بنو ساعدہ میں مسلمانوں کے انتخابی اجتماع میں

ایک دفعہ پھر انصار و مہاجرین کی تفریق منظر عام پر آئی۔ مہاجر اپنے تئیں خلافت کا حق دار سمجھتے تھے۔ اور انصار اپنی جگہ مدعی خلافت تھے اور حباب بن منذر انصاری نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک ہم میں سے ہونا چاہئے۔ دوسری طرت سیدۃ النساء حضرت فاطمہ کے مکان پر ہاشمی خاندان کے سرکردہ افراد کا اجتماع تھا۔ اور وہ خلافت کو اپنے خاندان کے لئے مخصوص تصور کرتے تھے۔ غرض کہ یہ مرحلہ امت کیلئے بڑا ہی سنگین تھا۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملت کا شیرازہ اس ابتدائی مرحلہ پر ہی پارہ پارہ ہونے والا ہے۔ مگر اس نازک حالت میں اعلیٰ درجہ کا مومنانہ عزم رکھنے والی دو شخصیتیں موجود تھیں۔ جنہوں نے اپنی عدیم التعلیل فراست و تدبیر سے امت کو اختلاف و انتشار سے بچالیا۔ میری مراد ان دو شخصیتوں سے صدیق اکبر اور فاروق عظیم ہیں۔ بالآخر صدیق اکبر کو اتفاق رائے سے خلیفہ جن بیا گیا۔ مگر اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ تینوں گروہ اگرچہ استحقاقِ خلافت کے مدعی تھے۔ لیکن چونکہ ان کے دل ایمان و یقین سے منور تھے۔ اس لئے وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ملت کا شیرازہ ان کے ہاتھوں سے بکھر جائے۔ چنانچہ ملت کی وحدت کو قائم رکھنے کے لئے انہوں نے جلد یا بدیر حضرت صدیق اکبر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس سلسلہ میں حضرت علی مرتضیٰ کے خلوص و ایثار پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ کہ باوجود اسکے کہ وہ اپنے تئیں خلافت کا رہل تصور کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ بھی ان کا سمناوا تھا۔

اگر وہ چاہتے تو ایک جُداگانہ متوازن حکومت قائم کر سکتے تھے۔ یا کم از کم دوسروں کے لئے مشکلات پیدا کرنا ان کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا لیکن انہوں نے محض اسلئے ایسا نہیں کیا۔ کہ انکی وجہ سے اتحادِ دولت کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچے۔ ابوسفیان جیسے سیاست کار انکی حمایت میں تلوار اٹھانے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ ابوسفیان نے واشگاف الفاظ میں یہ کہہ دیا تھا۔ کہ اے علی! اگر تم چاہو تو مدینہ میں ایک آدمی کو بھی زندہ نہ رہنے دوں گا۔ اور مدینہ کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہا دوں گا۔ مگر اس مردِ فقیر نے صاف جواب دے دیا۔ میں خلافت و امارت کے لئے امت کے انتشار کا باعث نہ بنوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ فاتحِ خیر کے دوسرے فضائل و مناقب کچھ کم نہیں ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان کی عظمتِ شان کی سب سے بڑی سند یہ ہے کہ انہوں نے آخر تک مرکزِ اسلامی کی اطاعت سے انحراف نہیں کیا۔ حالانکہ انکی نظر میں انکے پیشینہ تینوں خلفاءِ خلافت کے حقدار نہ تھے۔ اگر وہ چاہتے تو بہت کچھ کر بھی سکتے تھے۔

بہر حال یہ ابتدائی مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ اور پوری امت نے ایک ایسی شخصیت پر اتفاق کر لیا۔ جو فی الواقع اس منصب کے لئے موزوں تھی۔ اس عہد میں مانعینِ زکوٰۃ اور مسلیمہ کذاب کے قتلے ضرور اُٹھے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی نہایت مستحکم تھا۔ اور تمام انصار و مہاجرین خلوصِ قلب اور کمالِ کجہتی سے فریقہ و فاع امت میں سرگرم تھے۔

اسلئے یہ فتنے اٹھتے ہی دب کے رہ گئے۔

حضرت صدیق اکبر کے بعد ایک دوسرا مردِ خدا بھی مسلمانوں میں موجود تھا۔ جس کی ذات میں خدائے قدوس نے بیشمار صلاحیتیں پیدا کی تھیں۔ اور اگر دیکھا جائے تو صدیق اکبر کے عہدِ خلافت میں بھی اس جلیل القدر ہستی کی خداداد بصیرت و فراست اور حیرت انگیز قوت انتظامی بڑی حد تک کار فرما تھی۔ انہوں نے اپنے زمانہ خلافت میں جس بے نظیر عزم و تدبیر کے ساتھ حکومت کا کاروبار چلایا اسکی مثال آج تک دنیا نے نہیں دیکھی۔ حضرت عمرؓ کی ذات دشمنانِ ملت کے مقابلہ میں شمشیر برہنہ تھی۔ اور دنیا کی تمام چھوٹی بڑی طاقتیں ان سے رزاں اور خائف تھیں۔ اور جب تک آپ زندہ رہے کسی اپنے یا بیگانے کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ مگر جب یہ جلیل القدر ہستی دنیا سے اٹھ گئی تو سوئے سوئے فتنے پاک لخت جاگ اٹھے۔ اور اس مصیبتِ عظمیٰ کا وقت آپہنچا جسکی نسبت خود سردارِ دو جہاں فرما گئے تھے کہ میری امت میں سمندر کی طرح ایک ٹھاٹھیں مارنے والا فتنہ برپا ہوگا۔ الٹی تموج کموج البحر۔ اور اس فتنہ کی راہ میں حضرت عمر کا وجود گرامی ہی لکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ان بینک و بینہما باباً مغلقاً (قول خلیفہ چنانچہ اس بابِ مغلق کے ٹوٹنے کے بعد یہ فتنہ اس طرح اُٹا کہ آج تک اس کی تباہ کاریوں سے امت کو نجات نہیں مل سکی۔ و لعل اللہ یجدث بعد ذالک امراً۔ یہ فتنہ کیا تھا۔ کیا باہر سے کوئی آفت ناگہانی طور پر

آگرمی تھی۔ یا خود امت کے اندر یہ فتنہ پرورش پارہا تھا۔ اس کا جواب ممکن ہے کہ بہت لوگوں کو اجنبی معلوم ہو۔ مگر جو حقیقت ہے وہ کسی کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی محتاج نہیں ہے۔ وہ ہر حال میں قائم و دائم ہوتی ہے۔ اور کبھی نہ کبھی اپنی صداقت تسلیم کر اہی لیتی ہے۔ ۵

حقیقت خود کو منوالیتی ہے مانی نہیں جاتی

در اصل حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد ملکی سیاست میں کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں، جن کا سلجھانا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ خاندان نبی ہاشم پہلے ہی سے خلافت کو اپنا موروثی حق تصور کرتا تھا۔ اور انکی نظر میں دوسرے لوگ غاصب تھے۔ حضرت علیؓ کی وسعت قلب و نظر اور عدلیق و عمر کی اعلیٰ انتظامی قابلیتوں کی وجہ سے انکو پہلے اپنے ارادوں کی تکمیل کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد انکے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ اور دیرینہ خاندانی رقابت کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ حضرت عثمانؓ اگرچہ انتہائی درجہ کے نیک سیرت پاک طینت اور صالح انسان تھے۔ مگر انکی سیاسی حکمت عملی دور اندیشانہ نہ تھی۔ اور نہ ہی وہ فاروق اعظم کی طرح کار عب و جلال کہتے تھے۔ چنانچہ انکی سادگی اور نرمی سے نبی پور کو فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ نبی پور مسلمانوں کے گھرانے سے تعلق ضرور رکھتی تھی۔ اور ہو سکتا ہے کہ ان میں کچھ لوگ نیک بھی ہوں۔ مگر جس چیز کا پچھلے سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔ (یعنی اسلام کے دل نصب العین سے گہری عقیدت) وہ ان میں موجود نہ تھی۔ اور اسکی جگہ ان میں

قبیلوی اور خاندانی عظمت و قارہ کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں ایک بڑی جماعت صحابہ کرام کی موجود تھی۔ مگر انکی ایک بڑی تعداد شام و فلسطین وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور جو ارضِ حجاز میں موجود تھے۔ ان میں کچھ لوگ خاندانِ نبویہ سے عقیدت رکھتے تھے۔ کچھ الگ تھلگ غیر جانبدارانہ مسلک رکھتے تھے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو حضرت عثمانؓ کی کمزور حکمتِ عملی سے مطمئن نہ تھے۔ غرض کہ ملتِ اسلامیہ کے اندر ہی کچھ ایسے اسباب پیدا ہو چلے تھے جن کا پہلا حملہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی صورت میں وقوع پذیر ہوا۔ بہر حال سطور بالا سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ سب سے پہلے ملتِ اسلامیہ میں جو فساد و اختلال رونما ہوا اسکے نفوذ کی راہ خاندانی اور نسلی رقابت و عصبیت تھی۔ اور اسی عہد کو فسادِ امت کا نقطہ آغاز تصور کرنا چاہئے۔

ہر تاریخی واقعہ اپنا ایک ذہنی پس منظر رکھتا ہے جو
امت کا دورِ تنزل | اس واقعہ کی خارجی تشکیل سے پہلے تکمیل کے مختلف

مراحل طے کر رہا ہوتا ہے۔ اور ایک خاص تناسب سے وہ خارجی ماحول پر اثر انداز ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تکمیلی مراحل طے کرنے کے بعد معاشرہ کے تمام عملی گوشوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اگر ہم کسی مخصوص واقعہ کو مسلمانوں کی تخریب و انتشار اور فساد و تنزل کا سبب قرار دینگے تو وہ یقیناً غلط ہوگا۔ اسلئے یہ کہنا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے افسوسناک واقعہ سے امت میں انتشار رونما ہوا، صحیح نہیں ہے۔ بلکہ

دیکھنا یہ ہے کہ اس المناک سانحہ کے پس پردہ کون سے ذہنی عوامل کا رد فرماتے
ہاں یہ صحیح ہے کہ اس عالم ہست و بو میں ایک واقعہ کئی دوسرے واقعات
کا سبب بن سکتا ہے۔ اور جس طرح ذہنی کائنات اسباب و نعل کی آماجگاہ
ہے۔ اسی طرح خارجی ماحول بھی اسباب و علل کی طویل و استقامت ہے۔
اور بادی النظر میں شہادت عثمان کے واقعہ کے بعد ہی مسلمانوں میں دو
مستقل پارٹیاں پیدا ہوئیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک پارٹی نے شہادت
عثمان کے واقعہ کو محض پولیٹیکل سٹنٹ کے طور پر استعمال کیا۔ اور اسٹیٹ
میں دیرینہ نسلی رقابت اور ہوس اقتدار ہی کا رد فرماتھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ
اسلام میں اتحاد و مرکزیت کو جو اہمیت حاصل ہے اسکے پیش نظر اسلام
کسی فرد یا جماعت کو اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی معمولی یا غیر معمولی
واقعہ کو سامنے رکھ کر اسلامی مرکزیت کو پارہ پارہ کر دے۔ اور مستقل طور پر
امت کے نظام اجتماعی میں انتشار و طوائف الملوک کا دروازہ کھولے
یہ صحیح ہے کہ حضرت عثمان کی شہادت کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا جسکو
یہی نظر انداز کر دیا جاتا۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ملت کی سیاسی
وحدت کو قائم رکھنا اس سے بہت زیادہ اہم اور ضروری تھا۔ اور کون
کہہ سکتا ہے کہ امیر معاویہ اور انکی پارٹی کے لوگ اسلام کی اس مسئلہ
حقیقت سے بے خبر تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ ان کو ملت کے عمومی مفاد کے
احترام پر مجبور کرنے والا جذبہ اب کمزور پڑ گیا تھا۔ اور اب ان کے دل
مفادات یا جزئیہ سے اس درجہ متاثر تھے کہ مفادِ کلی کے احساس کا ان میں

بہت کم حصہ باقی رہ گیا تھا۔

حضرت علی مرتضیٰ کو انصار و مہاجرین کے اصحاب حل و عقد نے خلیفہ منتخب کیا تھا۔ اور آئینی حیثیت سے ان کی خلافت بالکل حق بجانب تھی اس بنا پر تمام مسلمانوں کا مذہبی اور اخلاقی فرض تھا کہ بلا حیل و حجت انکی اطاعت کرتے اور اگر کسی کو انکے سیاسی یا غیر سیاسی طرز عمل سے اختلاف تھا تو اسکی اصلاح بجز اسکے ممکن ہی نہ تھی کہ مرکز سے وابستہ رہتے ہوئے خلیفہ کو اسکے طرز عمل کی تبدیلی کے لئے مجبور کیا جاتا۔ یعنی اگر امیر معاویہ کی جماعت کا حقیقی مقصد اتنا ہی تھا کہ قاتلین عثمانؓ سے قصاص لیا جائے تو اس مقصد کے لئے اگر وہ مرکز سے وابستہ رہتے ہوئے جدوجہد کرتے تو کامیابی کا زیادہ امکان تھا۔ لیکن امیر معاویہ نے جو طرز عمل اختیار کیا اس سے نہ صرف یہ کہ وہ اس مقصد کے حصول میں ناکام رہے بلکہ مرکزیت اسلام کو بھی درہم و برہم کر دیا۔ ان حقائق کے پیش نظر اس بات کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ شریعت اسلامیہ کی نظر میں ملت کے انتشار کی ذمہ داری حضرت پیغمبرؐ عائد ہوتی ہے۔

اس بات کو موضوع بحث بنانے کی ضرورت نہیں ہے کہ حضرت علیؓ ذاتی طور پر ماہر سیاست داں تھے یا نہ تھے۔ یا ان سے کچھ سیاسی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں یا نہیں! اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ حضرت عمرؓ کی طرح اعلیٰ پایہ کی سیاسی بصیرت اور انتظامی قابلیت نہ رکھتے تھے۔ یا گورنروں کی معزولی کے عاجلانہ اقدام اور دار الخلافہ کو فہم میں منتقل کرنے میں انہوں نے

سیاسی غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ پھر بھی یہ بات بچائے خود ایک حقیقت ثابتہ کا درجہ رکھتی ہے۔ کہ اب مسلمانوں کی ذہنی اور فکری حالت خلافت راشدہ کے ابتدائی دور جیسی نہ تھی۔ اور اس وقت کا سیاسی ماحول بھی حضرت صدیق اور حضرت عمرؓ کے زمانہ سے بالکل مختلف تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے بہترین اہل فکر کا مخلصانہ تعاون حضرت علیؓ کی ذاتی کوتاہیوں کی کما حقہ تلافی کر سکتا تھا۔ اور کتاب و سنت کے صریح احکام کے پیش نظر مسلمانوں کو یہی راہ عمل اختیار کرنی چاہئے تھی۔ کہ وہ کامل یکجہتی اور غیر متزلزل عزم کے ساتھ مرکز ملت کی اطاعت کرتے۔ اور اتحاد ملت کی خاطر تمام ذاتی اور قبیلوی مفادات کو نظر انداز کر دیتے۔ مگر سخت افسوس ہے کہ ان کی غیر اسلامی روش نے ملت اسلامیہ کو ہمیشہ کے لئے فتنہ و فساد کی آگ میں جھونکا دیا۔

وما کان قیس ہلکۃ ہلاک و احدی۔ ولکنہ بنیان قوم تعدا ما۔
 اور پھر انہوں نے دعوائے خلافت پر ہی اکتفا نہیں کی۔ بلکہ حضرت علیؓ کے خلاف لوگوں کو اکسلانے میں انتہائی کوشش کی۔ اور ایک غرضتک ان دو جماعتوں میں معرکہ ہائے قتال بپا رہے۔ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ مسلمانوں کی دو جماعتوں کی باہم رقیبانہ کشاکش و آویزش اسلام کی نظر میں بہت بڑا جرم ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے ہر ایسے گروہ کے خلاف جنگ و قتال کا حکم دیا ہے۔ جو مرکز اسلامی کے خلاف آمادہ بغاوت ہو۔ نیز ان

۱۲۔ آئندہ چل کر اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی جائیگی۔

سیاسی جنگوں میں حضرت امیر معاویہ کی طرف سے جس قسم کی سیاسی حکمت عملی (ڈپلومیسی) اختیار کی گئی وہ کسی لادنی نظام سیاست میں تو کھپ سکتی ہے۔ لیکن اسلام کی سیاست عادلہ میں اسکے لئے قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً واقعہ تحکیم ہی کو سامنے رکھئے۔ اس میں کس طرح قرآن کریم کو محض سیاسی مقصد پر آری کے لئے استعمال کیا گیا۔ یعنی جب وہ مخالف گروہ کی فاتحانہ یلغار کو قوت بازو سے روکنے میں ناکام رہے تو قرآن حکیم کو سامنے لا کر کیا کر آؤ ہم اور تم اسکے مطابق فیصلہ کر لیں۔ لیکن ان کے دل میں کچھ اور ہی تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک نئے شدہ سازش کے ماتحت تحکیم کا سہارا لیا۔ اور اس میں حضرت عمرو بن العاص نے جو سیاسی چال چلی، وہ ایک صحابی رسول تو کیا کسی معمولی مسلمان کو بھی زیب نہیں دیتی۔ چنانچہ اس واقعہ سے کچھ جلیل القدر صحابہ مثلاً ابو موسیٰ اشعری اس درجہ متاثر ہوئے کہ وہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کو چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔

جب کسی قوم میں ملی اور اجتماعی احساس مفقود ہو جاتا ہے تو اسکے ساتھ دیانت، صداقت اور تمام اچھی صفات رخصت ہو جاتی ہیں۔ اولہ بھر اس کا ہر قدم ہلاکت و بربادی کی جانب اٹھتا ہے۔ چنانچہ واقعہ تحکیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے مسلمانوں میں صرف دو ہی فرقے تھے۔ اب ایک تیسرا خطرناک فرقہ (خوارج) بھی معرض وجود میں آ گیا۔ جو آنے والے دور میں مسلم حکومتوں کے لئے زبردست خطر بنا رہا۔

اذا کان خیر اللہ للعرع عذرا - اتتہ الرزایا من وجوہ الفوائد

تاریخ زوال امت کا دوسرا دور | دولت بنی امیہ کا بنیادی پتھر حضرت

کی بنیاد کا یہ عالم ہوا اسکے بام و در کی پختگی کا خود ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

عجیب کی بہاریہ ہوا اسکی خزاں نہ پوچھ

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ان کی جگہ حضرت امام حسنؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ مگر وہ از خود منصب خلافت سے سبکدوش ہو گئے۔ اور اس طرح ان کے اس دانشمندانہ اقدام نے اسلامی مرکزیت کو انتشار سے بچالیا حق یہ ہے کہ انسان کی عظمت کا راز اسکے اخلاقی اور ملی کردار ہی میں مضمر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس بات میں ابن رسول سے کون سبقت لے جا سکتا ہے؟ اور پھر ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ انکے نانا حضرت احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے۔

ابنی هذا سید و لعل اللہ
ان یصلح بہ بین فئتن من
المسلمین۔ (بخاری)

میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اور شاید کہ
اسکے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں
میں مصالحت ہو جائے۔

حضرت امام کے اس عدیم النذر اشارے نے ملت کو اتنا فائدہ نہ پہنچایا
کہ اس سے پہلے مسلمانوں کے دو جدا جدا مرکز تھے۔ اور اب تمام مسلمان
ایک ہی مرکز کے ماتحت آ گئے۔ مگر حضرت معاویہ اگر اسلامی مرکزیت کو نسلی
عظمت و تفوق کا ذریعہ نہ بناتے اور خلافت راشدہ کی طرح نظامِ شہ
کے تحت حکومت کا کاروبار چلاتے تو آج ان کو بھی خلفاء راشدین کی طرح

عقیدت و احترام سے یاد کیا جاتا۔ مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اسلامی جمہوریت کو طوکیت میں تبدیل کر دیا۔ اور اس سے ملت کے نظام جماع میں بے شمار مفسد کے نفوذ کے لئے ایک دوسرا رخسہ پیدا ہو گیا۔ یعنی اس سے پہلے نسلی شعور کی راہ سے فساد و اختلال داخل ہوا تھا۔ اور اب اس شعور نے اپنی پشت پناہی کے لئے اقتدارِ طوکیت کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور اس طرح اب وہ ناقابل شکست قوت کا مالک بن گیا۔

جب کوئی نیا تصورِ زندگی معرض وجود میں آتا ہے۔ تو وہ اگرچہ ابتدا میں بظاہر منقرض معلوم ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ اپنے تمام متعلقات و لوازمات کو ساتھ ہی لے کر آتا ہے۔ چنانچہ امیر معاویہ کے زمانہ میں مطلق العنانہ طرز حکومت کے مفسد نے ملت پر اس طرح ہجوم نہیں کیا تھا جس طرح ان کے بعد انتہائی شدت کے ساتھ جسم ملت میں سرایت کرتے چلے گئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ دن امت کے لئے منحوس ترین دن تھا جبکہ اسلام کے مقدس نظام شوریٰ کی جگہ نظام شاہی کی بنیاد پڑی۔ اس المناک سانحہ سے انسانیت دم بخود رہ گئی اور حضرت محمد مصطفیٰ صلعم کی روح کا تاباں مٹھی ہو گئی۔ کیونکہ اس واقعہ نے امت مسلمہ کے طرز فکر و عمل کو ایسے رخ کی جانب پھیر دیا۔ کہ وہ ابد الابد کے لئے صحیح فکر اسلامی سے محروم ہو گئی ظاہر ہے کہ اس سے بڑا المناک سانحہ امتِ محمدیہ کے لئے کیا ہو سکتا ہے؟

قریب ہے کہ اس سے آسمان بھٹ جائیں
(آیہ) زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گرے پڑیں

تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَنْفَطَرْنَ مِنْهُ
وَتَشَقُّ الْأَرْضُ وَيَخْرُجُ الْجِبَالُ كَسُدُومٍ

حضرت امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولیعہد بنایا۔ اور اسکی بیعت کا کام اپنی زندگی ہی میں مکمل کیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے جس قسم کے کردار کا مظاہرہ کیا اسکے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اپنے طرز عمل سے اس مقام شرف کو رسوا کر دیا جو صحابی رسول ہونے کی حیثیت سے ان کو حاصل تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر حضرت عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمان بن ابی بکر نے جانشینی اور ولیعہدی کے خلمات آواز بلند کی۔ اور ان حضرات نے صاف کہہ دیا کہ تم صدیق و خیرؐ سے بہتر نہیں ہو۔ اور تمہارا بیٹا ان کے بیٹوں سے افضل نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں میں سے کسی کو نامزد نہیں کیا۔ اور تمہیں بھی ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ مگر امیر معاویہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بجز اُس جو آپ کے جو ہمیشہ ایسے مطلق العنان حکمرانوں کی طرف سے اہل حق کو دیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پورے جلال کے ساتھ ان حضرات سے کہہ دیا کہ اگر تم اب اس معاملہ میں زبان کھولو گے تو سر قلم کر دینے جائیں گے۔ اور پھر مسلمانوں کے اجتماع میں آکر لوگوں کو یوں مخاطب کیا کہ اے لوگو! ابن عمرؓ ابن ابوبکرؓ اور ابن الزبیرؓ آج مسلمانوں میں سب سے زیادہ لائق احترام ہیں۔ اور انہوں نے یزید کی بیعت کر لی ہے۔ یہ تینوں حضرات پاس ہی سُن رہے تھے۔ مگر خطرہ جان کی وجہ سے بول نہ سکتے تھے۔ بعد میں مسلمانوں نے دریافت کیا تو انہوں نے کہا ہم نے یزید کی اب تک بیعت نہیں کی۔ لیکن خطرہ جان کی وجہ سے ہم بول نہ سکتے تھے۔

اب ہر شخص خود ہی اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ جیسا شخص
سیاسی اغراض کے لئے لوگوں کو اتنا بڑا فریب دے سکتا ہے تو بعد
میں آنے والے امرار و سلاطین کی کیا حالت ہوگی؟ اور اگر ان امرار
نے بعد میں خاندان بنی ہاشم اور دیگر اہل علم و تقویٰ پر رزہ خیز مظالم ڈھائے
اور انسانیت سوز اعمال کا ارتکاب کیا تو یہ کوئی خلافت تو فتح بات نہ تھی
کیونکہ مطلق العنانہ طرزِ حکومت سے جبر و تشدد، غصب حقوق، کذب پروری
عیاشی، بددیانتی، اور بیکروفریبی کے سوا کس چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔
چنانچہ امیر معاویہ کے بعد یہ تمام مفاسد و معائب نکھر کر سامنے آ گئے۔

تجدید و اصلاحِ دین کی ایک کوشش | یہ نہیں ہو سکتا کہ رات
کی تاریکی ہمیشہ کے لئے

چشمِ انسانی کو شعاعِ آفتاب سے محروم نہ رکھے۔ اور فسق و معصیت کی
تیر و تار گھٹائیں تا ابد رشد و ہدایت کی نوریانی کرنوں پر چھائی رہیں۔ یہاں
روزِ اول ہی سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ جب رات کی تاریکی حدِ کمال کو
کو پہنچ جاتی ہے تو یک لخت ہی نورِ سحر کی نمود ہوتی ہے۔

چنانچہ اسلامی تاریخ میں بھی آج تک یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے۔

سلیمان بن عبد الملک نے زندگی بھر میں کوئی اچھا کام کیا ہو گا یا نہیں
اور دنیا جانتی ہے کہ اس اموی حکمراں نے محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم
ایسے جری اور نامور اسلامی جرنیلوں کو بے گناہ قتل کر دیا تھا۔ مگر یہ بات
کس قدر حیران کن ہے کہ اس نے مرنے سے پہلے بنو امیہ کے عام دستور کے

خلاف اپنے بیٹے کے بجائے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین بنایا جنہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کو نظام شاہی کی گرفت سے نکالا۔ اور دوسرے نو اسلام کے نظام شہری کو بحال کیا۔ اور پھر آپ نے ان تمام مفسد کی اصلاح کے لئے مؤثر قایم اٹھایا۔ جو ان کے پیشرو حکمرانوں کی ہوسناکیوں نے اسلامی معاشرہ میں پیدا کئے تھے۔

مجددِ ملت عمر بن عبدالعزیز کا سیاسی نقطہ نظر دیگر اموی سلاطین و امراء سے بالکل مختلف تھا۔ یعنی دوسرے حکمرانوں کی تمام تر جدوجہد فتح ممالک اور توسیع مملکت کے لئے تھی۔ چنانچہ ان کے عہد حکومت میں بلاد افریقہ، اسپین، اور سندھ وغیرہ ممالک مسلمانوں نے فتح کر لئے تھے اور قسطنطنیہ پر بھی کئی دفعہ چڑھائی کی گئی۔ جس میں ہر دفعہ ناکامی ہوتی رہی مگر حضرت مجددِ اول رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فتح ممالک کی نسبت قلوب و ذہان کی دنیا کی تسخیر زیادہ اہم تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کا فکر و ذہن غیر اسلامی رہے گا ممالک کی تسخیر سے اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی پوری توجہ اصلاح و تعمیر ملت کے لئے وقف کر دی۔ اور سب سے پہلے انہوں نے اپنی ذات اور اہل خاندان سے اصلاحی پروگرام کی ابتدا کی۔

حق یہ ہے کہ خدائے قدوس کو اس مرد مومن سے تجدیدِ ملت کا کام لینا تھا۔ اور اس میں وہ تمام صفات کمال موجود تھیں جو منصب تجدید و احیاء دین کے لئے ناگزیر ہیں۔ ان کی ذات فقیر شاہی کے دو گونہ واردات

وکالات میں ذاتِ مصطفیٰ سے اللہ علیہ وسلم کی تجلیات کا عکس تھی۔

خسروی شمشیر درویشی نگاہ
فقرو شاہی وارداتِ مصطفیٰ
ایں دو گوہراں محیطِ لا الہ
ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفیٰ

غرض عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ڈھائی سالہ دورِ حکومت میں اتنا کچھ
کر دکھایا کہ انسانی عقل و نگارہ جاتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کے بعد
امراء بنی امیہ میں ان جیسا کوئی با شعور اور دور اندیش حکمراں نہ پیدا
ہو سکا۔ اور اندسرِ مطلق العنانہ نظامِ حکومت مسلمانوں پر مسلط
ہو گیا۔

اعتقادی تخریب و فترت
نسلی عصبیت یا عصبیت جاہلیہ تو پہلے سے
کم و بیش تھی۔ لیکن حضرت علیؑ کے دورِ خلافت

میں ایک جدید عقیدہ و مسلک رکھنے والے شیعہ فرقہ نے جنم لیا اور واقعہ
تخلیم کے بعد ایک تیسرا مذہبی گروہ (خوارج) بھی پیدا ہو گیا۔ اور پھر
اول الذکر فرقہ سے کئی اور فرقے پیدا ہوئے۔ مثلاً فرقہ باطنیہ اور توہرین
وغیرہ! یہ مذہبی فرقے ایک دوسرے کے خلاف شدید تعصب اور اختلاف
رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہر فرقہ دوسرے کو کافر اور مرتد قرار دیتا تھا۔
اپنے عقائد کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ہر ایک فرقہ نے کتاب و سنت
کا سہارا لیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کی دینی اور اعتقادی وحدت
کو ان فرقوں کے اختراعی تصورات نے شدید نقصان پہنچایا۔
ان فرقوں کی حیثیت صرف مذہبی ہی نہ تھی۔ بلکہ وہ جدید دعوت کے

ذریعہ اموی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے سیاسی انقلاب بپا کرنے کی لگاتار کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اور بالآخر ابو مسلم خراسانی کی پر اسرار دعوت نے اموی حکومت کا خاتمہ کیا اور ۱۳۲ھ میں بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی۔

تاریخ زوالِ امت کا تیسرا دور اسلامی تاریخ کے ہر نئے دور میں دورِ باہمی

بھی سر اٹھاتا رہا ہے۔ چنانچہ عباسیوں کے عہد حکومت میں نسلی عصبیت، ملوکیت اور اعتقادی تعصب و افتراق کی تباہ کاریاں بدستور موجود رہیں اور ان کے علاوہ ایک جدید فتنہ کا آغاز ہوا۔ یہ نیا فتنہ عقلیت پرستی یا ”ذہنی مرعوبیت و کمتری“ کا تھا۔ جس نے مسلمانوں کے رہے ہوئے فکری سرمایہ کو بھی ختم کر دیا۔

دورِ نبی امیہ میں اور تمام بُرائیاں موجود تھیں۔ مگر اتنی بات ضرور تھی، کہ علما و قضات کو تقریب و تخریب کی آزادی حاصل تھی۔ اور وہ کھلے بندوں امر اور سلاطین کے غیر شرعی اعمال پر نکتہ چینی کر سکتے تھے۔ مگر عباسی دورِ حکومت میں حریتِ فکر و رائے پر بھی پیرے بٹھا دیئے گئے۔ اور علمبردارانِ کتاب و سنت کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ اور اسکے برعکس ایک عقلیت پرست فرقہ (معتزلہ) کو بڑھنے اور پھیلنے کے لئے نہ صرف کہاں چھوڑ دیا گیا۔ بلکہ اسکی ہر طرح سرپرستی کی گئی۔ اس فرقہ نے قرآنی عقائد و ایمانیات اور لے ہم آگے کسی موقع پر امویوں اور عباسیوں کی ”علمی خدمات“ سے بحث کرینگے۔

احکام و اعمال کو عقل و فلسفہ کے معیار پر پرکھنا شروع کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکمتِ قرآنی یونانی فلسفہ کے طبعی اور مابعد الطبعی تصورات کے تہ بہ تہ پردے ڈال دیئے گئے۔ اگر اس زمانہ میں امام احمد بن حنبلؒ امام غزالیؒ امام ابن تیمیہؒ علوم کتاب و سنت کے احیاء کی کوشش نہ کرتے تو اس دور کے عقل پرستوں کی ناپاک کوششیں کامیاب ہو جاتیں۔ مگر جیسے کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اہل ہوا اور بانیانِ فساد کے مقابلہ میں علمبردارانِ علومِ سنت اور اصحابِ تجدید دین بھی پیدا ہوتے رہے جنکی مجاہدانہ کوششوں نے ملتِ اسلامیہ کے ذہنی سرمایہ کو کم و بیش بچائے رکھا۔

یہ فرقہ خوار دولتِ عباسیہ کے ساتھ ہی رخصت ہوا۔ اور آج ہمیں اہل سنت کی کتابوں ہی سے پتہ چلتا ہے کہ معتزلہ کے نام سے کوئی فرقہ ہو گزرا ہے۔ ورنہ اس نام کا کوئی مذہبی یا غیر مذہبی گروہ آج مسلمانوں میں موجود نہیں ہے۔ مگر اس میں شک نہیں ہے کہ ایسے لوگ آج بھی مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ جن کا ذہن ”افکارِ غیر“ کا محکوم ہے۔ اور وہ اپنے ساتھ قرآن کو بھی مغربی مکاتب فکر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ جب قرآن حکیم کی حکمتِ بالغہ سے بحث کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن حکیم ہیگل، روسو، کارل مارکس، اور دیگر مغربی علماء و مفکرین کے افکار و خیالات کی ترجمانی کے لئے نازل ہوا ہے۔ اور ان کے نزدیک قرآن کے نزول کی غرض محض سیاسی عروج و ارتقاء کی تکمیل ہے۔ چنانچہ وہ

ہر قرآنی حکم کو اسی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

جب قوم کے سامنے ذاتی عزت و وقار اور جاہ پرستی کے سوا کوئی پاکیزہ اور ملی نسب العین نہ ہو تو اس سے لامحالہ وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل میں تنشاً رونما ہوتا ہے۔ اور گروہی مفادات میں خطرناک تضادم شروع ہو جاتا ہے چنانچہ امت اسلامیہ نے اپنے اعلیٰ نصب العین کو چھوڑ دیا تو اس میں سب سے پہلے نسلی اور قبیلوی رقابت و خصمیت پیدا ہوئی۔ اور آگے چل کر اس نے تغلب و تسلط کی شکل اختیار کر لی۔ اغراض میں تضادم و کشمکش رونما ہوئی اور ہر گروہ نے اپنے مقصد کی خاطر ایک نئی دعوت اور نیا مسلک پیش کیا جس سے کئی مذہبی فرقے پیدا ہوتے چلے گئے۔ اور پھر آگے جا کر اسلامی تصور زندگی سے مسلمان اس قدر چلے گئے کہ انکی نظر اسلامی تصورات اور غیر اسلامی افکار و خیالات میں تمیز ہی نہ کر سکی اور قرآنِ مذہب کو بازیچہ اطفال بنا دیا۔ غرض جب مسلمانوں کے فکر و عمل میں انتہائی درجہ کی لامرکزیت پیدا ہو گئی تو انکی سیاسی مرکزیت بھی پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ تیسری صدی کے آخر میں مسلمانوں کے تین جدا جدا مرکز بن گئے۔ عراق، اندلس، اور شمالی افریقہ۔ بغداد آل عباس کا مرکز خلافت تھا۔ اندلس میں امویوں نے۔ اور شمالی افریقہ میں فاطمیوں نے الگ الگ خلافتیں قائم کر لی تھیں۔ اور پھر یہ تین مراکز بھی آگے چل کر کئی چھوٹے چھوٹے مرکزوں میں تقسیم ہو گئے۔ خلافتِ عباسیہ کے سوا باقی حکام خود مختار بن گئے اور انہوں نے مرکز سے تعلق منقطع کر لیا۔ اموی خلافت کی وحدت بھی

قائم نہ رہ سکی۔ اور پانچویں صدی میں اندلس کے مغربی اور مشرقی اقطاع
 میں بنو عبید، بنو مظفر، بنو جہور، بنو حمود، بنو الفری، اور کئی دوسرے
 خاندانوں کی الگ الگ ریاستیں قائم ہو گئیں۔ اور ان ریاستوں کے
 حکمرانوں نے اپنے لئے مقتدر باللہ، معتصم باللہ، معتد باللہ، متوکل
 باللہ، معتقد وغیرہ کے پرہیت القاب تجویز کر رکھے تھے۔ چنانچہ اس
 افسوسناک انتشار و طوائف الملوک کی کو دیکھ کر اندلس کے مایہ نحر ادیب
 ابو علی حسن بن اشیق نے یہ شعر کہے تھے۔

مما یرھد فی ارض اندلس سماع مقتدر، فیہا ومعتقد
 القاب مملکۃ فی غیر موضعها کالہرة تحلی انتفا خاصوۃ الالہ
 اس دور انتشار میں اندلس کے شمالی حصہ یعنی بحر اعظم سے ملحقہ علاقوں
 میں بنو مظفر کی حکومت تھی۔ یہ ریاست نسبتاً زیادہ خوشحال تھی اور
 اسکے حکمران اہل علم کے بہت ہی قدر واد تھے۔ اس زمانہ کے مشہور شاعر
 وادیب ابو محمد عبد المجید بن عبدون نے ایک بلند پایہ عربی قصیدہ قلمبند
 کیا تھا۔ جس میں شاعر نے بنو مظفر کو مخاطب کیا تھا۔ یہ قصیدہ بہت
 طویل ہے۔ جو کم از کم انہی اشعار پر مشتمل ہے۔ اسکے چند ابتدائی اشعار
 ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ جس چیز نے مجھے ارض اندلس سے متنفر کیا ہے۔ وہ معتد اور معتقد جیسے ناموں
 کا سنا ہے۔ یہ سلطنت کے القاب ہیں جو بالکل بے محل ہیں۔ جیسے بلی بھول بھول کر
 شیر جیسی بہیت کا اظہار کر رہی ہو۔

الدهر يفتح بعد العين بالاشتر
 اخماك اخماك لا آلوك مؤعظده
 فالدهر حرب وان ابدى مسالمة
 في كل حين لها في كل جارحة
 كم دولته وليت بالنصر خدتها
 فما البقاء على الاشباح والصوا
 عن نومة بين ناب الليث والظفر
 والبيض والسود مثل البين لسها
 لنا جراح وان تراغت عن النظر
 لم يتبق منها وسل ذكر الك من خبها
 (بحواله المنجب)

بالآخر ان پر آزمائش کی وہ گھڑی آ پہنچی جو ایسی غفلت شعار قوموں
 کے مقدر ہے۔ فما بکت علیہم السماء والارض وما كانوا منتظرین
 آل عباس کی خلافت کا ٹمٹاتا ہوا چراغ تاتاریوں کے ہاتھوں گل ہوا۔
 اور ۶۵۹ء میں دوبارہ مصر میں عباسی خلافت نے جنم لیا جو قریباً تین سو
 سال تک اقتدار و خیراں چلتی رہی۔ مگر بالآخر ترک حکمران سلیم اول نے اسکا
 بھی خاتمہ کیا اور خلافت اب غیر قریشی خاندان میں منتقل ہو گئی۔

لہ زمانہ اشخاص و اعیان کے بعد انکی نشانیوں پر ماتم کرتا ہے۔ لیکن اشباح و صور پر رونے
 سے کیا فائدہ؟۔ میں تجھے بار بار دکتا ہوں (اور میں تجھے نصیحت کرنے میں کوتاہی نہیں کرونگا)
 شیر کی ڈارٹوں اور اسکے پنجوں کے درمیان سوٹے سے۔ پس زمانہ سراپا جنگ ہے، اگرچہ وہ بظاہر
 امن کا اظہار کرے۔ اسکی سفید اور سیاہ چیزیں درحقیقت تلواریں اور نیزے ہیں۔ وہ ہر لمحہ
 ہمارے جسم کے ہر حصہ کو زخمی کرتا ہے۔ اگرچہ یہ زخم ہمارے نظر سے پوشیدہ ہوں۔
 کتنے ممالک ہیں جن کو فتح کرنے کے بعد ان کی خدمت کا کام تجھے سونپا گیا۔ اور
 اب ان سے کوئی بھی باقی نہیں ہے۔
 اور تو اپنی سرگذشت تاریخ سے پوچھ لے۔

بحث کے ابتدائی حصہ میں لکھا جا چکا ہے کہ حکومت و اقتدار کے لئے نظم و اتحاد، شجاعت و تہور۔ اور احساسِ ملی کی ضرورت ہے۔ اور جس قوم یا طبقہ میں یہ صفات موجود ہوں، وہ یقیناً سیاسی اقتدار کا مالک ہوگا۔

ترک انتہائی درجہ کے سخت کوشش، جفاکش، دلیر اور جنگ جوتھے، ان میں اعلیٰ درجہ کا نظم و اتحاد تھا۔ دینداری اور سادگی تھی۔ اسلئے وہ مسلسل چھ سو سال تک اقوامِ دنیا کے قائد رہے۔ مگر ملوکیت جسے "ام المفسد" کہنا چاہئے۔ ان میں بھی ابتدا ہی سے موجود تھی۔ اور اسکی وجہ سے تدریجاً ان میں وہ تمام معائب پیدا ہوتے چلے گئے۔ جو ملوکیت کا لازمہ ہیں۔ اور جن کی وجہ سے پہلی حکومتیں تباہ ہوئی تھیں۔

اسی طرح ہندوستان کو شروع میں جن حکمرانوں نے فتح کیا تھا۔ بلاشبہ ان میں نظم و اتحاد، قوت ایمانی، عزم و بہمت موجود تھی۔ مگر یہاں بھی متذکرہ مفسد تدریجاً پیدا ہوتے گئے۔ اور بالآخر عہد اکبری میں بالکل وہی حالت ہو گئی۔ جو دور عباسیہ کی تھی۔ یعنی اس دور میں بھی دینِ خداوندی کو تختہ مشق بنایا گیا۔ لادینی اور الحاد نے قوت پکڑ لی۔ اور دوسروں کی ہر ادرا حسین معلوم ہونے لگی۔ اس دور میں اصلاح و تجدید دین کے لئے خدائے قدوس نے حضرت سید احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو پیدا کیا جن کی ضربت کاری نے دینِ الہی کے عنیم اکبر کو پاش پاش کیا۔

گماں مبرکہ خورِ حساب و میزانِ نیست نگاہِ بندہ مومن قیامتِ خرد نیست
دجال

حضرت مجدد کے بعد بھی مصلحین پیدا ہوتے رہے مگر مسلمانوں کا فساد اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ اصلاحی کوششوں کے باوجود بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ جسم ملت کا کوئی حصہ اسکی زد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور بالآخر یہاں بھی مسیحیت کے ہاتھوں مسلمانوں کی عظمت و شوکت پوند خاک ہو کر رہ گئی۔ وکان امر اثر مفعولا۔

گذشتہ سطور سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اخلاقی اسباب میں بنیادی حیثیت رکھنے والے چار اسباب ہیں۔ عصبیت جاہلیہ۔ ملوکیت و آمریت۔ اعتقادی عناد و تعصب اور ذہنی و ثقافتی مرعوبیت۔ تاریخ اسلامی کے ہر نئے دور میں یہ اسباب بدستور موجود رہے ہیں۔ اور یہ بنیادی اسباب مسلمانوں کے ہر طبقہ میں اسکی مخصوص ذہنی ساخت اور ماحول کے مطابق نئے نئے مقاصد کی تخلیق کرتے رہے ہیں۔

ذہنی مرعوبیت و تاثر کو تاریخی اعتبار سے چوتھے نمبر پر رکھا گیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عہد عباسیہ سے پہلے یہ سبب فساد موجود ہی نہ تھا۔ دراصل غور سے دیکھا جائے تو نسلی عصبیت اور ملوکیت و آمریت بھی تو غیر اسلامی رجحان فکر کی پیداوار ہیں۔ اور اس لحاظ سے متذکرہ اخلاقی اسباب کو اسی ایک سبب میں سمٹایا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ عہد عباسیہ میں ایک باضابطہ اور منظم تحریک کی شکل میں غیر اسلامی علوم و افکار کی نشر و اشاعت کی ابتدا ہوئی۔ اس بنا پر اس کو چوتھی جگہ پر رکھا گیا ہے۔

اس مقام پر محتاسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ذہنی اور ثقافتی تبدیلی کے تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ ڈالی جائے تاکہ عصر حاضر کے مسلمانوں کے ذہنی موقف کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔

مسلمانوں کی ثقافتی تبدیلی کا تاریخی پس منظر

عصر حاضر کے مسلمانوں کی ذہنی آوارگی اور فکری انتشار کا صحیح موقت متعین کرنے کے لئے ہمیں بہت پیچھے ہٹ کر اس کے تاریخی عوامل کا جائزہ لینا پڑے گا۔

خلفائے راشدین کا دور سعادت علمی اور فکری لحاظ سے بالکل سادہ تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کا علمی ماخذ صرف کتاب اللہ اور سنت تھی۔ اور وہ زندگی کے تمام مسائل کے لئے ان ماخذ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ انہوں نے یونانی حکمت و فلسفہ یا دوسرے علوم و فنون کی طرف توجہ ہی نہیں کی تھی۔ اور ایسا کرنا ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ کیونکہ ان لوگوں نے براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے استفادہ کیا تھا۔ اور وہ علوم نبوت ہی کے ذریعے فطرت کے راز ہائے درون پردہ سے واقف تھے۔

امی بود کہ از اثر حکمت او واقف بر نہان خاتم تقدیر شدیم

اصل ما یک شریر با ختم سنگے بود است یک نظر کرد کہ خورد شد جہانگیر شدیم

اور ظاہر ہے کہ ان یقینی علوم الہی کے ہوتے ہوئے ان کو یونانی ادہام

و خرافات میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

نیز اس دور میں مسلمانوں کے سامنے اقامتِ دین، دعوت و اصلاح اور تاسیسِ مملکت ایسے اہم کام تھے جن کے لئے مسلسل اور لگاتار جہدِ عمل اور ذوقِ یقین کی ضرورت تھی۔ اور اس شرف کے لئے ان کو یقینِ محکم اور ولولہ عمل پیدا کرنے والے علوم ہی کام دے سکتے تھے۔ ایمان و یقین اور قوتِ عمل کو مضحک کرنے والے علوم کی انکو قطعاً ضرورت نہ تھی۔

اموی عہد اقتدار نے اگرچہ مسلمانوں میں بہت سے مفاسد پیدا کئے مگر جہاں تک تہذیب و ثقافت اور آدابِ معاشرت کا تعلق ہے۔ وہ بہت حد تک اغیار کے اثرات سے محفوظ رہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اموی حکمران خود ہی اپنی مخصوص تہذیب اور کلچر کو عجمی تہذیب سے الگ رکھنا پسند کرتے تھے۔ اور پھر اس دور میں غیر اسلامی علوم و فنون کی اشاعت و ترویج کے لئے کوئی باقاعدہ اور منظم کوشش نہیں کی جاسکی۔ البتہ اموی عہد کے دورِ متوسط میں سب سے پہلے خالد بن یزید بن معاویہ جسکو حکیم آل مروان کا لقب دیا گیا تھا، نے اہم سابقہ کی کچھ کتابوں کے تراجم کا اہتمام کیا تھا۔ اس نے یونانی فلسفہ کی ایک جماعت کو اپنے پیراں طلب کیا۔ اور ان کو حکم دیا کہ وہ کتبِ صنوت (کیمیا وغیرہ) کو یونانی اور قطعی زبانوں سے عربی میں منتقل کریں۔ اسکے بعد ہشام بن عبد الملک نے دیوانِ اشام کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ مگر اس دور میں جو کچھ ہوا وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر حسبِ عینا سنی عہد اقتدار کی ابتدا ہوائی تو غیر اسلامی لٹریچر کو کثرت کے ساتھ عربی زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع ہوا۔ کیونکہ

دولتِ عباسیہ کا قیام ہی دراصل اہل خراساں اور موالی کامرہوں کی احسان تھا۔ اور اسکی وجہ سے عباسیوں اور خراسانیوں کا باہم اختلاف ایک ناگزیر امر تھا۔ چنانچہ اس اختلاف نے آل عباس میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ اہل فارس اور اہل یونان کے علوم و فنون سے واقفیت بہم پہنچائیں۔ سب سے پہلے دولتِ عباسیہ کے دوسرے حکمران ابو جعفر منصور نے جو حسن بن جبریل کو کتب یونان کے ترجمہ پر مامور کیا اور اس نے بہت سی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا۔ اسی طرح حنین بن اسحاق نے بقراط اور جالینوس کی بیشمار طبی کتابوں کا ترجمہ کیا۔

اسکے بعد جب ہارون کا زمانہ آیا تو اس دور میں انقرہ اور عمور یہ فتح ہوئے اور کتب یونان کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا۔ جس کے ترجمہ کا خاص اہتمام کیا گیا۔ اسکے بعد مامون جو خود بھی صاحب علم اور بڑا نقاد تھا۔ اس نے اس کام کو پہلے کی نسبت بہت تیز کر دیا۔ بلکہ اس عہد میں مامون کے علاوہ اور بھی بہت سے اہل ثروت نے اس کام کی طرف خاص توجہ دی۔ مثلاً احمد محمد اور حسن جو شاکر المصنوع کے بیٹے تھے۔ انہوں نے کچھ علماء فلسفہ کے ذریعہ فلسفہ و ہندسہ، موسیقی اور طب کی عجیب و غریب مصنوعات روم سے منگوائیں اور علماء کی ایک جماعت کو ان کے ترجمہ کے کام پر لگایا۔ اس جماعت میں حنین بن اسحاق، حبیش بن الحسن اور ثابت بن قرہ وغیرہ شامل تھے اور ان مترجمین کے پانچ پانچ سو ماہانہ وظائف مقرر کئے گئے۔ اسی طرح دوسرے بہت سے لوگوں نے اس کام میں بڑے بڑے حصے لیا۔

دوسری اقوام کے علوم و فنون سے واقفیت حاصل کرنا کوئی بُری بات نہیں ہے اور ہر چیز جسکی بنیاد حکمت و دانش پر ہو وہ مرد مومن کا موروثی حق ہے۔ نیز اسلام اتنا تنگ طرف بھی نہیں ہے کہ وہ علمی حرکت و ارتقا سے مانع ہو لیکن اسلام کی نظر میں جو چیز خطرناک ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے اسلامی سرمایہ فکر کو غیر اسلامی تصورات سے مخلوط کر دیں۔ یا ان کا فاروڈ ہن دوسرے علوم و افکار سے متاثر ہو جائے۔ چنانچہ خلفاء عباسی کی اس یونانیت نوازی جس پر بہارے مورخین کو بڑا فخر ہے۔ اور وہ اس عہد کو اسلامی تاریخ کا عہد قرار دیتے ہیں) کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں کئی ایسے گروہ پیدا ہوئے جنہوں نے اصول دین اور اسلامی عقائد کو بُری طرح مجروح کیا۔ یعنی یہ لوگ ایک نئے طرز فکر کے حامل تھے اور انہوں نے اسی انداز سے دینی اصول و عقائد کا جائزہ لیا اور دین خداوندی کو بالکل محرف کر دیا۔ یہ فتنہ پہلے پہل بصرہ سے اٹھا اور اسکے بعد اس نے بغداد کو اپنا مرکز و مستقر بنا لیا۔

بصرہ میں واصل بن عطاء الفزالی اور پھر عمر بن عبید عقل پرست گروہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ ثانی الذکر سے منصور کو بہت ہی انس تھا۔ اور وہ ان کو تمام علماء معاصرین پر ترجیح دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی موت پر خود منصور نے مرثیہ کہا تھا۔ اسکے بعد کچھ دوسرے اہل اعتزال اور اصحاب آزار پیدا ہوئے۔ مثلاً ابوالہذیل محمد بن الہذیل العلاف، ابراہیم بن سیار بنظام اور بشر بن غیاث المرسی، وغیرہ ان لوگوں نے اصول و عقائد اسلامی میں نئے نئے مباحث کے دروازے کھول دیئے۔

اس دور میں جن مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا وہ ہیں مسئلہ قدر و فعال
عباد۔ مسئلہ صفات باری اور مسئلہ خلق قرآن ! ان مسائل میں پل عزرائلی
جمہور المسلمین سے بالکل الگ رائے رکھتے تھے۔ چنانچہ مسئلہ قدر اور فعال
العباد کے بارے میں معتزلہ کی رائے یہ تھی کہ انسان خود ہی افعال کا خالق ہے
اور اس بنا پر وہ ثواب و عقاب کا مستحق ہے۔ اور قضا و قدر سے مقصود
اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق یا خذلان کا حاصل ہونا ہے۔ صفات الہی
کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ صفات سے پاک ہے۔ کیونکہ اسکے
لئے اگر صفات تسلیم کی جائیں تو وہ بہر حال قدیم ہونگی اور اس سے تعدد و قدم
لازم آئیگا۔ اسلئے وہ صفات کو عین ذات تصور کرتے تھے۔ چنانچہ خلق قرآن
کا عقیدہ بھی اسی مسئلہ کی پیداوار ہے۔ یعنی وہ جمہور اسلام کے عقیدہ کے
برعکس قرآن حکیم کو مخلوق مانتے تھے۔ اور اسکی وجہ یہ بیان کرتے تھے کہ قرآن
جن حروف و اصوات پر مشتمل ہے۔ خدائے تعالیٰ ان کو ایک جسم حادث میں
پیدا کرتا ہے۔ اور نبی ان کو سنتا ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک وحی کا مفہوم یہی
ہے۔ اس بنا پر قرآن اللہ کی صفت نہیں بن سکتا۔

اس خلق قرآن کے مسئلہ میں مامون بھی ان کا بہنو تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جن
علماء و ائمہ دین نے اس عقیدہ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا۔ ان کو اس نے
سخت سے سخت سزائیں دیں۔ دراصل اس مسئلہ میں ان دو گروہوں کا
اختلاف محض نزاع لفظی معلوم ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ سالہا سال تک
اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی۔

اسکے علاوہ اس دور میں خلافت کے مسئلہ پر اہل سنت اور شیعہ میں شدید اختلاف رونما ہوا۔ اور شیعہ فرقوں میں سے امامیہ اور زیدیہ بھی اس مسئلہ میں الگ الگ رائے رکھتے تھے۔ اور پھر ان دو فرقوں سے کئی دوسرے فرقے پیدا ہوئے۔

اہل سنت کے علمائے ان جدید فرقوں کے دفاع و مقابلہ کے لئے ایک مستقل فن (علم کلام) کی بنیاد رکھی۔ جس کے ذریعہ انہوں نے عقلی بنیادوں پر ہی اسلامی اصول و عقائد کی تعبیر کی۔ اور آج بھی ہمارے قدیم طرز کے مدارس میں یونانی فلسفہ اور کلام دونوں ہی ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے ہیں۔

دولت عباسیہ میں مامون کا عہد نہضت علمیہ کے اعتبار سے ممتاز خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے زمانہ میں ہر فرقہ کے علماء کو حریت فکر و رسد حاصل تھی۔ اور ان فرقوں میں روز و شب بحث و مذاکرہ اور مناظرہ و مجادلہ کے مور کے جاری رہتے تھے۔ دیکھا دیکھی ہر فرقہ نے اپنے خیالات و عقائد کے اظہار و بیان کے لئے نیا اسلوب اختیار کیا۔ اور نئی نئی کتابیں تصنیف کیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی توجہ قرآن کی سادہ تعلیم اور موثر طرز استدلال سے ہٹ گئی۔ اور اسکی حکمت بالغہ پر فلسفیانہ طرز استدلال کا غلاف چڑھایا گیا۔ چنانچہ آج تک ہمارے یہاں جس قدر تقاسیر مروج ہیں ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے نعوذ باللہ قرآن حکیم بھی یونانی فلسفہ کی کوئی ادق کتاب ہے۔

دیکھا ہر چیز معمولی میں نظر آتی ہے۔ اور بد قسمتی سے آج تک معمولی ہی سمجھا گیا۔ مگر کچھ وقت نظر سے دیکھا جائے تو یہ وہ خطرناک فتنہ تھا۔ جس نے ملتِ اسلامیہ کے فکر و ذہن کو ایک نئی سمت کی طرف پھیر دیا۔ اور اسکے بعد آج تک قرآن کو خود قرآن اور سنت کی روشنی میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ ہمیشہ غیر قرآنی طرزِ فکر سے قرآنی حقائق کو تولا اور ناپا گیا۔ اور اس سے فکر اور عمل کا باہم تعلق جو اسلامی تصورات کا طرہ امتیاز ہے جاتا رہا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلامی تصورات کلاسیکی علوم و افکار کی طرح کائناتی حقائق سے بے تعلق نہیں ہیں۔ بلکہ وہ سعی و عمل کے واسطے سے کائناتی مظاہر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یعنی وہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ جس سے انسان کو فطرت کے ہر اہم و حقائق کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے اندر جذب و تسخیر کی بے پناہ قوت پیدا کر لیتا ہے۔

چوں سرژہ رازی را از دیدہ فر و شستم

تقدیرِ احم دیدم پہاں بہ کتاب اندر

اسکے برعکس کلاسیکی علوم و تصورات تصوراتِ محضہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ خارجی ماحول میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکیں۔ یا ممکناتِ حیات کو درجہ فعالیت عطا کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال افلاطون کے مسلک "اعیان نامشہود" کو مسلک گو سفندی سے تعبیر کرتا ہے۔

راہب دیرینہ افلاطون حکیم از گروہ گو سفندانِ قدیم
منکر ہنگامہ موجود گشت خالق اعیان نامشہود گشت
دیارِ اندلس میں دولتِ امویہ کی "خدماتِ علمی" کا اگر جائزہ لیا جائے
تو وہ بھی افادہ حیثیت سے دولتِ عباسیہ کی خدماتِ علمیہ سے مختلف نہیں
ہیں۔ اور ان حکومتوں کے خاتمہ کے بعد اگرچہ اس مخصوص طرز کی حرکتِ
علمیہ آگے بڑھنے سے روک گئی۔ مگر چونکہ اس نے مسلمانوں کے ذہن کو
ایک دفعہ اسلامی فکر سے منجرت کر دیا تھا۔ اسلئے آنے والے ادوار میں
بھی مسلمان اسی لکیر کو پیٹتے چلے گئے۔ اور بد قسمتی سے آج تک اس سلسلہ
جاری ہے۔

تدوین احادیث | تدوین حدیث کا کام بھی اسی دور میں زور شور سے
شرع ہوا۔ چنانچہ امام بخاری۔ امام مسلم، اور
دیگر ائمہ حدیث اسی دور میں پیدا ہوئے۔ جنہوں نے فن حدیث میں بڑی
بڑی کتابیں تصنیف کیں۔

عہدِ رسالت اور زمانہ خلافتِ راشدہ میں احادیث کی ترتیب
و تدوین کا کام نہیں ہو سکا تھا۔ سب سے پہلے اموی خلیفہ حضرت عمر بن
عبدالعزیز کے زمانہ میں اس کام کی ابتدا ہوئی۔ اور عہدِ عباسیہ میں اس
فن کو عروج حاصل ہوا۔

اس سے پہلے نبی امیہ کے دور میں کئی مذہبی فرقے پیدا ہو چکے تھے۔
جنہوں نے اپنے معتقدات کی صداقت ثابت کرنے اور دوسروں کو

شکست دینے کے لئے ہزاروں حدیثیں وضع کیں۔ اور ان کو مسلمانوں میں کثرت سے پھیلا دیا۔ اس طرح ان کذابوں نے نہ صرف اس فن کو بدنام کیا بلکہ ان کے کذب و افتراء کی وجہ سے ملت اسلامیہ میں سخت ذہنی انتشار پیدا ہوا۔ مگر بعد میں آنے والے علماء حدیث نے انتہائی کاوش سے ان موضوعات کو امکانی حد تک الگ کیا بلکہ اس فن کو زیادہ سے مستند بنانے کے لئے انہوں نے روایت حدیث کے لئے نہایت کڑی شرائط وضع کیں۔ اور اس مقصد کے لئے روایت و درایت اور اسماء الرجال کے فن معرض وجود میں آئے۔ یعنی جہاں تک طاقت بشریہ کا تعلق ہے۔ انہوں نے فن حدیث کو مستند بنانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی۔

یہ صحیح ہے کہ یہ فن افراط و تفریط سے نہیں بچ سکا۔ مگر ہمیں بتایا جائے کہ اور کون سی چیز مسلمانوں کے دستِ تعوی سے محفوظ رہی ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ پر ان کا بس نہیں چل سکا۔ مگر اسکی معنوی تحریف میں انہوں نے کون سی کسر اٹھا رکھی ہے؟ محض اسوجہ سے کہ کچھ افتراء پر داندوں نے اپنی طرف سے حدیثیں وضع کیں، اس فن کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ احادیث کی ترتیب و تدوین کا کام بذات خود بُرا تھا۔ اگر سردارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم (جن کی ذاتِ رامی سے ہنگامہ وجود کی رونق ہے) کے اقوال و ارشادات کی طلب و جستجو اور ان کی جمع و ترتیب بُرا کام ہے تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ دنیا میں نیک کام کو نساہد سکتا ہے۔ اور پھر وحی الہی یعنی قرآن کریم

کے سمجھنے میں اگر زبانِ وحی کا لحاظ نہ کیا جائے تو اور کس چیز کو قرآنِ فہمی کا ذریعہ بنایا جائے۔ کیا قرآنِ کریم کو عقل انسانی کا محکوم بنا دیا جائے، کہ جس طرح کسی کا جی چاہے قرآنِ حکیم کی تفسیر کرتا پھرے۔ جیسا کہ بدقسمتی سے حدیث کی موجودگی میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فنِ حدیث کو نہ وال امت میں دخل نہیں ہے۔ بلکہ نہ وال امت کا حقیقی سبب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کو اس سے پہلے سنت کے بجائے حکمتِ یونان کی عینک سے دیکھا جاتا رہا۔ اور آج اسکو دانشِ فرنگ کے سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے۔

اہل خانقاہ اور ان کا تصوف یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس دور کے اہل مدرسہ کا حال تھا۔ لیکن اس زمانہ کے اہل خانقاہ نے بھی مسلمانوں کے ذہن و فکر کو بگاڑنے اور ان کے قوائے عمل کو مضمحل کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ چنانچہ دورِ عباسیہ میں یونانی علوم و فنون کی طرح ایرانی تصوف کو بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور علوم و فلسفہ کی طرح ایرانی تصوف بھی آج تک مسلمانوں کے اعصاب پر مسلط ہے۔

حق یہ ہے کہ اسلامی تصوف اور فقر کے نام سے آج تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اسکے تصور ہی سے سینہ کانپ اٹھتا ہے۔ اور جگر شق ہونے لگتا ہے بلاشبہ شرک و بدعت اور فسق و معصیت نے تصوف کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی عقائد و اعمال اور سیرت و کردار کو برسی طرح پامال کیا اور آج تک

یہی کچھ ہو رہا ہے۔ دنیا کی وہ کونسی بد کرداری ہے جو حلقہ ارادت میں آکر
 عین ثواب نہ بن جاتی ہو۔ اور وہ کونسی قومی خیانت ہے جو فقر کا لباس پہن
 کر قابلِ فخر کارنامہ نہ بنتی ہو۔

وہ اصل قوموں میں جب غلوں و دیانت اور احساسِ ملی عقود ہو جاتا
 تو وہ ہر مقدس چیز کو اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے آلہ کار بنا لیتی ہیں۔
 چنانچہ مسلمانوں نے فقر سے یہی سلوک کیا، اور نہ جہاں تک قرآنی فقر کا تعلق
 ہے۔ وہ ایک بلند تر اور مقدس تر اخلاقی طاقت ہے جو دنیا کے فراعنہ و
 نماردہ کو اپنے آگے سرنگوں کر دیتی ہے۔ اور اسکی ایک ہی جنبشِ نظرِ عالم
 ہست و بود میں تباہی برپا کر دیتی ہے۔

فقرِ حیاں عریاں شود ز بر سپہر از نہیب او بلرزد ماہ و مہر
 فقرِ عریاں گرمی بدر و شنین فقرِ عریاں بانگِ تکبیر حسین
 گر بد قسمتی سے مسلمانوں نے فقر کو مستی و طرب اور اغوی و سرور کا ہم
 تصور کر لیا۔

فقرِ قرآنِ احتسابِ ہست و بود نے ربابِ دوستی و رقص و سرود
 فقرِ مومنِ پیستِ تسخیرِ جہات بندہ از تاثیر او مولیٰ نہفات

اسباب فساد کے اعتبار سے اہم اسلامیہ جائزہ کا قف

اسباب زوال امت کی بحث سے مقصود بالذات دورِ حاضر کے مسلمانوں کے اجتماعی اور ملی مفاسد اور ان کے حقیقی اسباب فساد کی ٹوہ لگانا ہے کیونکہ ملت کی تعمیر جدید موجودہ اسباب فساد کی تشخیص اور انکی اصلاح و ازالہ ہی سے ممکن ہے۔ لیکن چونکہ عصرِ رواں کے اسباب فساد دورِ ماضی کے اسباب فساد ہی کے ارتقائی مراحل ہیں۔ اور زمانہ حال کے اسباب فساد کے اظہار و بیان میں دورِ ماضی کے اسباب فساد سے اغماض نہیں کیا جاسکتا اسلئے تاریخِ ماضی کے اسباب زوال و فساد پر اجمالی اور سرسری تبصرہ کیا گیا ہے۔

دورِ اصل امت کا زوال (جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس دن سے شروع ہوا ہے جبکہ مسلمانوں کے بنیادی تصورِ حیات میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اور نسلی و طبقاتی احساس و شعور نے ان کے ہمہ گیر احساسِ ملی پر تسلط جایا۔ لیکن قوموں کا زوال کچھ اس طرح غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر بڑھتا چلا جاتا ہے کہ اسکی تکمیل میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کا زوال پذیر سیاسی اقتدار ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک اقوامِ دنیا سے اپنی قوت و شوکت کا سکھ منواتا چلا آیا اور بالآخر اٹھارہویں صدی

میں اس دیرینہ مریض نے تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ اور اپنے پیچھے وہ
فقوش آثار چھوڑ گیا۔ جو تا ابد مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی یاد تازہ
کرتے رہیں گے۔۔۔

اگرچہ میکدہ سے اٹھ کے چل دیا ساقی

وہ مئے وہ خم وہ عراچی وہ جام باقی ہے

اس رُوبہ تنزل اقتدار کے دور میں مسلمانوں نے اگرچہ اپنی ملی سیرت
کا بہت بڑا حصہ ضائع کر دیا۔ اور اسکی جگہ غیر مسلم اقوام کے قومی خصائص
کو اپنے اند جذب کیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے دوسروں سے
جتنا کچھ اثر لیا اس سے کم یا زیادہ دوسرے لوگوں نے بھی ان کا اثر قبول
کیا اسلئے کہ یہ صاحب اقتدار تھے۔ اور دوسری قوموں کو طوعاً و کرہاً ان کا
رنگ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ مگر جب اقتدار دوسری قوموں کی طرف چلا گیا تو
اب مسلمانوں کی حالت اس بے کس اور مغلوبک الحال شخص کی سی ہو گئی جو
اپنے عسروا فلاس کی وجہ سے ہر خوشحال شخص کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
دیکھتا ہے۔ لیکن دوسرے لوگ اسکو دیکھ کر کتر ا جلتے ہیں۔ وہ دوسروں جیسا
بننے کی کوشش کرتا ہے لیکن دوسرے اسکی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند
نہیں کرتے۔ یہ مسلمانوں کی محکومیت اور عسرو غلامی کا دور ہے۔ اور یہ کھلی
ہوئی بات ہے کہ اس دور میں ان کے فکر و ذہن کے پنیے کی تمام راہیں بند
ہو گئیں۔ اور ان میں اپنی ملی سیرت کا کچھ حصہ باقی متبانی تو وہ غلامی کی نذر
ہو گیا۔ جو مفاسدان میں پہلے سے چلے آتے تھے۔ وہ دس گنا اور بڑھ گئے

یا ان مفاسد نے دانش حاضر کے زیر اثر بالکل نئی وضع اختیار کر لی۔
 مسلمانوں کا دور طو کیت اپنے پیچھے جو مفاسد چھوڑ گیا تھا وہ قریب
 قریب وہی ہیں جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ نظام شاہی
 اگرچہ اقتدار کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ لیکن اسکے پیدا کردہ تمام مفاسد
 جسم ملت کے رگ و پے میں راسخ ہو چکے تھے۔ اور دور غلامی نے ان کو
 اور زیادہ گہرا کر دیا۔ بلکہ تہذیب حاضر کے غلبہ و استیلا نے مسلمانوں
 کی دوازدہ صد سالہ کمزور اور مضمحل تہذیب کو بالکل ایک نئی سمت
 کی جانب پھیر دیا۔

مغربی تہذیب کا ذہنی پس منظر اسلامی تہذیب اور تہذیب مغرب
 میں کامل تضاد ہے۔ اسلامی تہذیب

میں اخلاقی اور مابعد الطبعی تصورات کو اساسی درجہ حاصل ہے۔ اور مغربی
 تہذیب کو دہریت والحاذا اور مادیت و تشکک نے پیدا کیا ہے۔ اسلئے
 یہ اخلاق، خدا پرستی اور دین و مذہب کی گرفت سے آزاد ہے۔ اور
 مادہ پرستی ہی اس کا دین و ایمان ہے۔

آج سے چار پانچ سو سال قبل کلیسائی دہبانییت کی سکون پرستی نے
 مسیحی اقوام کے قوائے عمل کو مضمحل کر رکھا تھا۔ اور اس دور میں جس کو
 دور نشاۃ جدید کا نام دیا گیا ہے۔ ان اقوام ہی سے کچھ ایسے لوگ پیدا
 ہوئے۔ جنہوں نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے زوال و انحطاط کا تہا سبب
 ہمارے سراپا غلط مذہبی تصورات ہیں۔ جن سے ہماری اجتماعی ترقی کی تمام

راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔ انہوں نے ابتدا میں کلیسا نواز جماعتوں کے جاہ و ساکن تصور زندگی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اور آگے چل کر اس جدید تحریک نے مطلق مذہب کو اپنا حریف بنا لیا۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ابتدا میں ہر انقلابی تصور کچھ بندھا سمٹا اور محدود ہوتا ہے۔ اور بڑی حد تک پرانے ماحول کی طاقت سے مرعوب ہوتا ہے۔ بلکہ بعض حالات میں اسکو کچھ کچھ قدیم تصورات کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ لیکن جس قدر قدیم ماحول کی بندش ڈھیلی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسی تناسب سے اس انقلابی تصور کا پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے۔ اور اگر یہ انقلابی تصور کسی معتدل اور متوازن فلسفہ زندگی پر مبنی نہ ہو تو آگے چل کر اسکا سیلا قدیم معاشرہ کی برائیوں کے ساتھ ساتھ اسکی اچھائیوں کو بھی بہالے جاتا ہے اور اس غیر متوازن انقلابی تصور کی اساس پر جس نئی تہذیب کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اس میں بے ترتیبی، بد نظمی، بے اعتدالی اور ہولناک تباہی کے محرکات روز اول ہی سے موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کے انقلاب پسندوں کی جدید تحریک بھی ابتدا میں عیسائیت کے تصور پر ہیست (جو اصل میں دینی تصور نہ تھا) کے خلاف اٹھی تھی۔ مگر آگے چل کر اس نے بجائے اصلاح و تعمیر کے تخریبی اور انقلابی شکل اختیار کر لی۔ اور سرے سے دین و مذہب کی عمارت ہی کو ڈھا دینے اور اسکے کھنڈروں پر لادینی و الحاد کا محل تعمیر کرنے کی مہم شروع کر دی گئی۔ یہی وہ تخریبی تصور تھا جس پر تہذیب جدید کی بنیادیں اٹھانی گئیں۔

بلاشبہ جو مذہب انسانوں کی عملی زندگی کے جدید تقاضوں سے
 تعرض نہ کرتا ہو۔ اور ممکناتِ حیات کو اجاگر کرنے میں قوائے انسانی کی مدد
 کرنے سے قاصر ہو۔ ایسے مذہب کی انسانوں کو ضرورت نہیں ہے۔ ایسا
 مذہب ممکن ہے کہ مردوں کو کوئی فائدہ دے سکے۔ لیکن زندہ انسانوں کو
 ایسے دین کی ضرورت ہے۔ جو ان کی عملی زندگی میں ان کا ساتھ دے سکے اور
 اور ہر قدم پر انکی رہنمائی کر سکے ہو۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انسانوں کو
 فطرت کی پہنائیوں سے آگاہ کرتا اور ان کو جذب و تسخیر کی بے پایاں قوت
 عطا کرتا ہوں۔ جس مذہب میں یہ شان تو انائی نہ ہو، وہ زندہ انسانوں کا
 مذہب بننے کی ہرگز صلاحیت نہیں رکھتا۔

ولئے آں دینے کہ خواب روترا باز در خواب گراں بار دترا
 نحر و افسون است یا دین است ایں حبلیون است یا دین است ایں (اقبال)
 مگر ان رجال انقلاب کے سامنے چونکہ اسوقت کی عیسائیت کا مسخ شدہ
 اڈیشن تھا۔ جسکے تصور رہبانیت نے قوم کے قوائے فکر و عمل کو معطل کر دیا تھا
 اسلئے اسکے خلاف ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہوئی ناگزیر تھی۔ لیکن اس نفرت
 نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ عیسائیت کے اُن مقدس اخلاقی تصورات کو
 بھی ناقابل عمل قرار دے دیا گیا۔ جن میں احترام آدمیت اور دیگر اعلیٰ اخلاق
 کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور پھر صرف عیسوی مذہب ہی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ
 ہر مذہب اور مذہب کی ہر چیز کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور کر لیا گیا۔ یہ
 ایک نہایت خطرناک لغزش تھی جس نے ترقی پسندوں کو اُن ہمہ گیر اصول

انسانیت سے محروم کر دیا جو انسانوں کو زندگی کا ایک معصوم اور بلند تر مقصد عطا کرتے۔ اور ان کی حیات اجتماعیہ کو ایک مخصوص آئینی نظم کے تحت آگے کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر انسانی جاوہد کو اخلاقی قیود و اقدار کی رعایت سے دور رکھا جائے تو لازمی طور پر زندگی میں بے پناہ خلیجان، خطرناک بد نظمی و بے ہنگامی اور تباہ کن انتشار رونما ہوتا ہے۔ جو انسانی جماعات کو دائمی سوشل و اضطراب کے جہنم میں ڈھکیں دیتا ہے۔

حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں مغرب نے جتنے بڑے بڑے مفکر پیدا کئے ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر حضرات صرف مادی نقطہ نظر سے حیاتِ انسانی کا جائزہ لیا۔ فلسفہ مادیت اور اسکے نظام تہذیب و تمدن کو سائنٹیفک اور اخلاقی و مذہب کو آن سائنٹیفک قرار دیا۔ چنانچہ سترہویں صدی کے نصف اول میں ڈیکارٹ نے فلسفہ مادیت کی بنیاد رکھی۔ اور اسی صدی کے نصف آخر میں مغرب کے مشہور فلسفی ہابس نے نظام کائنات کی میکانکی طریق سے توجیہ کی۔ اور مابعد الطبیعی تصور کا انکار کیا۔ اس صدی میں ادبیت سے اہل فکر پیدا ہوئے جو محض مادی نقطہ نظر سے عقدہ زندگی کو حل کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی میں جوزف پرستلیے، ڈالٹنیر، روسو، اور دیگر کئی حکما پیدا ہوئے جنہوں نے فلسفہ مادیت کو پہلے سے زیادہ وسعت دی۔ اور ان میں سے اکثر نے خدا کے وجود کا انکار کیا۔ انیسویں صدی میں اسپنر نے علامتیہ خدا کا انکار کیا اور کائنات کے خود بخود پیدا ہونے اور

خود بخود ارتقائی مراحل طے کرنے کا نظریہ بلند آہنگی سے پیش کیا۔ اور دارو
کے نظریے ارتقائی رہی سہی کسر لوپی کر دی۔

مگر آج عمل کی تجربہ گاہ میں یہ سائنٹیفک نظریات نہ صرف ناکارہ بلکہ شر
فساد اور عالمگیر شورش و بدمعنی کے محرک ثابت ہو چکے ہیں۔ چنانچہ آج قوام
مغرب کے سنجیدہ فکر اور حساس لوگوں نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ موجودہ
ہمہ گیر شورش و اضطراب اور انسانیت کی نہرہ گداز بربادی کا سبب
یہی ہے کہ تہذیب حاضر کو ان معصوم اور مقدس اصول انسانیت سے الگ
رکھا گیا ہے۔ جو انسانوں میں خیر و شر کی تمیز اور احترام انسانیت کا جذبہ
پیدا کرنے والے ہیں۔

عصر تو ازہر مرزاں آگاہ نیست

دین او جز حب غیر اللہ نیست

کاش کہ ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ مذہب انسانیت کا بہترین محافظ
اور ہمہ گیر اصول انسانیت کا علمبردار ہے۔ اور اگر عیسائیت ان کی عملی
زندگی کی جدید ضرورتوں کو پورا نہ کر سکتی تھی تو ان کے لئے صحیح راہ عمل
یہ تھی کہ وہ انسانیت کے مفاد عامہ کی خاطر اسلامی فلسفہ حیات کی طرف
رجوع کرتے۔ اگر ان کو اس کی توفیق نصیب ہوتی تو بلاشبہ وہ عقیدہ
زندگی کو حل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ کیونکہ قرآنی فلسفہ زندگی حیات
انسانی کے تمام شعبوں پر یکساں نظر رکھتا ہے۔ وہ صرف روح کی پیش کی
تسکین ہی نہیں کرتا بلکہ مادہ و جسم کے تمام مطالبات سے عہدہ برآ ہونے

کی کامل صلاحیت رکھتا ہے۔ اور زندگی کے ذہنی اور خارجی اجزا میں حیرت انگیز اعتدال و توازن پیدا کرتا ہے۔ نیز کائنات عالم میں یہی وہ جامع اور ہم گیر فلسفہ زندگی جو اقوام عالم میں ایک وسیع تر رشتہ اخوت پیدا کر سکتا ہے اور یقیناً اسی کے ذریعہ دنیا کو امن و سکون کی دولت میسر آ سکتی ہے۔

ممالک اسلام میں تہذیب و تمدن کا اثر و نفوذ گذشتہ مباحث میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس سے اندازہ

کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف اسلامی تہذیب تھی جو صدیوں سے مائل بہ انحطاط تھی۔ اور بیرونی اثرات سے اس درجہ متاثر ہو چکی تھی کہ اس میں کسی نئی طاقتور تہذیب کا مقابلہ کرنے کی تاب ہی نہ تھی۔ اور دوسری طرف مغربی تہذیب تھی جو اپنی زہرا لود اور انسانیت کش فطرت کے باوصف تمام جدید آلات اور علمی اکتشافات سے مسلح تھی۔ بالآخر اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں اسلامی تہذیب ضعف و انحطاط کے آخری نقطہ پر پہنچ چکی تھی اور مغربی تہذیب اپنے دورِ شباب میں قائم رکھ چکی تھی چنانچہ ان کے باہم تصادم سے اسلامی تہذیب کا وہی حشر ہوا جو کسی تہذیب کے مقابلہ میں کمزور چیز کا ہو سکتا ہے۔

چونکہ قوم کی تہذیب و تمدن کا انحطاط دراصل اسکے قواعد فکر و عمل کا

انحطاط ہے۔ اور جو قوم فکر و عمل کے لحاظ سے انحطاط پذیر ہو وہ اپنی حریت و آزادی اور مقام شرف کو محفوظ رکھنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی یہی وجہ تھی کہ اٹھارہویں صدی میں مغربی اقوام کی یلغار سنہ قریباً تمام

عالم اسلامی کو تہ و بالا کر دیا۔ اور سوائے ایک دو اسلامی ممالک کے کوئی اسلامی ملک ان کی زد سے نہ بچ سکا۔ بلکہ جہاں تک اقوام غالبہ کی تہذیب و ثقافت کے اثر و نفوذ کا تعلق ہے اس سے کوئی اسلامی ملک محفوظ نہ رہ سکا یعنی مغربی اقوام نے غلبہ و اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنی مخصوص حکمت عملی سے مسلمانانِ عالم کے ذہن و فکر اور دین و مذہب میں بھی تصرف کیا جو ممالک عملاً محکوم ہو گئے تھے۔ انہوں نے تو بہر حال اقوام غالبہ سے اثر لینا تھا لیکن جن اسلامی ممالک نے ایک حد تک اپنی آزادی کو برقرار رکھا، وہ بھی ذہنی مرعوبیت سے محفوظ نہ رہ سکے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ذہنی غلامی میں زیادہ اسلامی ممالک محکوم ممالک سے بھی سبقت لے گئے۔ اور اگر دیکھا جائے تو اقوام مغرب کی وسیع اور طاقتور سلطنتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی ایک دو محدود اور غیر ترقی یافتہ حکومتوں کی حقیقت ہی کیا تھی۔ محکوم ممالک کے مسلمانوں کی طرح ان میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ اہل مغرب کے عروج و ارتقاء کا اصل منبع ان کی سائنٹیفک تہذیب ہی ہے۔ اور اب ہمارے لئے عروج و ترقی کا بجز اسکے کوئی راستہ نہیں ہے۔ کہ ہم ان کا کامل اتباع کریں اور جس شاہراہ پر چل کر انہوں نے قوت و اقتدار اور عزت و جاہ کا بلند مقام حاصل کیا ہے۔ ہم بھی اسی راہ پر چل کر ترقی کی منزلیں طے کریں۔

اسکے علاوہ جو اسلامی ممالک مسیحی اقوام کی غلامی میں چلے گئے تھے ان میں تو یہ حکمراں قومیں سیاہ و سپید کی مالک تھیں۔ اور محکوم مسلمانوں کی

قسمت کی باگ ڈور ان کے قبضہ اقتدار میں تھی۔ اسلئے ان مسلمانوں کے قبلہ و کعبہ کا رخ بدلنے میں ان کے لئے کچھ دقت نہ تھی۔ لیکن مسلمانوں کے آزاد اور خود مختار ممالک کی ملکی سیاست بھی ان اقوام کی ریشہ دوانیوں سے متاثر رہی ہے۔ اور جو ملک سیاسی اعتبار سے اس قدر کمزور ہو کہ وہ بیرونی سیاسی قوتوں کے اثر و نفوذ کی مقاومت نہ کر سکتا ہو وہ اپنی تہذیب و ثقافت کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

حاصل یہ ہے کہ جو اقوام اعلیٰ سیاسی اقتدار کی مالک ہوتی ہیں وہ محکوم اور کمزور اقوام کے ذہن و فکر پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسلامی ممالک (اگرچہ ان میں سے اکثر آزاد ہو چکے ہیں) ایک سے ایک بڑھ کر ذہنی مرعوبیت میں مبتلا ہیں۔ مگر ان کے مختلف طبقات میں اس ذہنی مرعوبیت و کمتری کے مظاہر الگ الگ ہیں۔ ان کا ایک طبقہ وہ ہے جو غیر ملکی اقتدار کی گود میں پلا ہے۔ اور وہ اپنے ظاہر و باطن میں بالکل اپنے آقاؤں کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ چنانچہ تمام عالم اسلامی اور بالخصوص پاکستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنے سفید آقاؤں کے نقش قدم پر چلنے کو اپنا قابل فخر امتیاز تصور کرتے ہیں۔ ان کا ذہن کچھ اس طرح مسخ ہو چکا ہے کہ اس میں احساس ذات کا کوئی شائبہ تک باقی نہیں رہا۔ شاید فرنگ کی برادرا پر جان دیدینا ہی ان کا شعار ہے اور ان کے پاس جس قدر علمی اور ذہنی سرمایہ ہے وہ خدایان فرنگ ہی سے انہوں نے مستعار لیا ہے۔

عقل تو زنجیری افکار غیر در گلوے تو نفس از تار غیر
 بر زبان گفتگو ہا مستعار در دل تو آرزو ہا مستعار
 آفتاب ہستی یکے در خود نگہ از نجوم دیگر اں تابے مخر
 تا کجا طوفی چراغ محفلے ز آتش خود سوز اگر داری ڈلے

ایک دوسرا گروہ ہے جس کو موجودہ نظام سرمایہ داری کی نفرت نے
 کارل مارکس اور لینن کے قدموں پر جھکا دیا ہے۔ اور وہ اشتراکی فلسفہ
 زندگی پر ایمان رکھتا ہے۔ دراصل یہ گروہ بھی پہلے گروہ کی طرح در یوزہ
 ہے۔ اور اس میں بھی مشرف النفس اور احساس ذات کا فقدان ہے۔
 آخر کار نہ طرز زندگی اور غیر اسلامی تصورات سے عقیدت کا اسکے
 سوا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا ذہن اسلامی تصورات کی
 عقیدت و احترام سے بالکل خالی ہے۔ اور وہ اپنی ملی روایات سے
 نا آشنا ہیں۔

از سوال آشفتمہ اجزا خودی بے تجلی نخل سیناء خودی
 وائے بر منت پذیر خوان غیر گردش خم گشتہ احسان غیر

ایک تیسرا گروہ ہے جو مذکورہ دو گروہوں سے زیادہ خطرناک ہے
 یہ گروہ اپنے ساتھ مذہب اور قرآن کو بھی مغربی مکاتب فکر کی طرف لے
 جانا چاہتا ہے۔ اور اسکے پیشرو وہ لوگ ہیں جو مغربی علوم و فنون
 کی کچھ سوچ بوجھ رکھنے کے علاوہ عربی زبان سے بھی قدرے واقف ہیں

مگر یہ لوگ براہِ راست قرآنِ کریم سے استفادہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے بلکہ استاذانِ یورپ کی عینک چڑھا کر قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں، دور جب یہ قرآن کی حکمتِ بالغہ سے بحث کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ قرآنِ حکیم جدید مغربی حکماء و فلاسفہ کی ترجمانی کے لئے اُترا ہے قرآنی آیات کو انسانی نظریات پر منطبق کرنے کے لئے پوری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ خواہ اس میں آیات قرآنی کے اصلی منشا اور سیاق و سباق کا خون ہی کرنا پڑے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ حکومت کی کلر کی اختیار کرنے کے لئے بھی کسی علمی سند اور سارٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر علوم قرآنی کی تفسیر و تعبیر کے لئے آج کسی علمی قابلیت کی ضرورت نہیں ہے جس کا جی چاہے وہ بے دریغ قرآنِ کریم کو مشقِ ستم بنانا شروع کر دیتا ہے اور انتہائی دیدہ و لیری سے قرآنی آیات کو مسخ کرنے لگتا ہے۔

ان لوگوں کی علمی بصیرت پر ماتم کرنا چاہئے کہ جب ان کے مغربی ائمہ ضلال کی طرف سے کوئی نیا اکتشاف سامنے آتا ہے تو یہ قرآن میں دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس میں کہیں ایسی آیت مل جائے جس کو اس جدید نظریہ پر منطبق کیا جاسکے۔ اور جب اس میں کسی طرح کا میاب ہو جاتے ہیں، تو مادے خوشی کے اچھلنے لگتے ہیں اور غریب مولویوں کو بے لفظ سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر ان نئے مفسروں سے کوئی پوچھتا نہیں کہ خدا کے بند و ماتم اس جدید اکتشافات سے پہلے کہاں تھے؟ آخر یہی قرآن اس سے پہلے بھی تمہارا سپاس تھا۔ اگر تم اتنے صاحبِ بصیرت تھے تو اس

پہلے تم نے قرآن حکیم سے کسی جدید نظریہ کا انکشاف کیا ہوتا۔ اور پھر ایجاد و اختراع کے میدان میں اگر غریب مولوی کچھ نہیں کر سکا تو تم نے کون سے ہوائی جہاز اور ایٹم بم تیار کر لئے ہیں۔ قرآن حکیم کو مسخ کر کے اسکو حکمت مغرب کے سانچے میں ڈھالنا کونسی مشکل بات ہے۔ جس پر تم فخر کرتے ہو بلکہ یہ تو انتہائی درجہ کی ذہنی گراوٹ ہے۔ ان لوگوں سے بس اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ خدا! قرآن حکیم کو مذاق نہ بناؤ۔ تم خود جس طرف جانا چاہتے ہو بیشک جاؤ لیکن قرآن حکیم کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر نہ لے جاؤ۔

عصر حاضر کا سب سے بڑا فتنہ | تہذیب مغرب نے امم اسلامیہ کو جو گراں بہا تحفے دیئے ہیں۔ ان میں ایک بڑا تحفہ وطنی قومیت (نیشنلزم) کا تصور ہے۔ جس نے عالم گیر اخوت اسلامی کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور آج ہر ملک کے مسلمان اپنے آپ کو دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے الگ قوم تصور کرتے ہیں۔

قرن اول سے ایک ہزار سال تک مسلمانانِ عالم میں بیشمار اجتماعی اور ملی مفاسد پیدا ہوئے۔ ان میں خاندانی رقابت بھی تھی۔ اور سیاسی اور مذہبی جنگیں بھی ہوتی رہیں۔ مگر اتنی بات تھی کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک گہرے اعتقادی رشتہ میں منسلک تھے۔ اور جغرافی یا وطنی حدود ان کے اس مقدس رشتہ کی راہ میں حائل نہ تھیں۔ تمام عالم اسلامی ایک مرکز خلافت کو تسلیم کرتا تھا۔ جسکی وجہ سے انکی وحدت ملی مستحکم تھی چنانچہ آج سے کچھ عرصہ پہلے سلطنت عثمانیہ کو مسلمانانِ عالم میں مرکز ملی مقام

حاصل تھا۔ لیکن مغربی اقوام کے استعمار پسندانہ عزائم کی راہ میں مسلمانوں کا یہ وسیع تر رشتہ اخوت رکاوٹ بن سکتا تھا۔ اسلئے ان اقوام نے تمام ممالکِ اسلامیہ میں وطنی عصبیت کو ابھارنے کی ناپاک مہم شروع کی۔ اور اس میں ان کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ مسلمان جو اس سے پہلے قوم واحد تھے کئی وطنی قومیتوں میں بٹ گئے۔ اور اسکے نتائج وہ اب تک بھگت رہے ہیں۔ مگر حیرانی کی بات ہے کہ ان تلخ نتائج کے باوجود آج تک وہ اسی خطرناک راستہ پر گامزن ہیں۔ چنانچہ اہم اسلامیہ کی آج بھی یہ حالت ہے کہ ترک کی اپنے مخصوص ملکی مفاد کی خاطر اہم عربیہ کے مفاد سے پہلو تہی کر جاتا ہے۔ اور عرب لیگ اپنی مصلحتوں کے پیش نظر ہندوستان ایسے مسلم کش ملک کی حمایت کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک ان کو اس بات کا احساس نہیں ہو سکا کہ کسی ایک ملک کے محض اقتصادی یا کسی دوسرے جزوی مفاد کی نسبت اجتماعی اور ملی مفاد کی رعایت عالمِ اسلامی کو دنیا کی عظیم ترین طاقت بنا سکتی ہے۔ اور یہ اجتماعی اور ملی طاقت ہر اسلامی ملک کی حفاظت و میانیت اور اسکے اقتصادی استحکام کی ضامن ہو سکتی ہے۔ بہر حال تہذیبِ حاضر نے ملتِ اسلامیہ کو جو کچھ دیا ہے اس کا حال عصرِ حاضر کے اسلامی مفکر اقبال کی زبان سے سنئے۔

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد می شناسی عصر مارا ما چہ کرد
عصر مارا ز ما بیگانہ ساخت از جمالِ مصطفیٰ بیگانہ ساخت

مباحثِ ماضیہ پر نظر ثانی

جب ہم اُمت کے مستقبل کی تعمیرِ جدید کا تصور کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ہمارا ذہن متعدد اُمور کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ پہلے یہ کہ تعمیری لائحہ عمل کی ترتیب و تدوین سے قبل ہم اپنے ماحول پر جچی تلی، اور نہایت گہری نگاہ ڈالیں۔ اور اسکے تمام مفاسد کو چن چن کر سامنے لائیں۔ دوسرے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہمارے موجودہ ماحول کو ادوارِ ماضیہ سے کیا نسبت ہے۔ اس سلسلہ میں ماضی کے اسبابِ زوالِ اُمت پر عمیق اور تنقیدی نگاہ ڈالنا، اور پھر فسادِ اُمت کے نقطہٴ ابتدا اور نقطہٴ انتہا، اور مختلف تاریخی ادوار کے تخریبی عوامل کو زیرِ بحث لانا ضروری ہے۔ نیز ان تاریخی ادوار میں اصلاح و تعمیر اور احیا و تجدید دین کی جس قدر انفرادی یا اجتماعی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ ان کا اجمالی تعارف بھی بہر حال ناگزیر ہے۔ تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ ماضی کی کامیاب اور ناکام کوششوں کی کامیابی اور ناکامی کے اسباب و وجوہ کیا ہیں؟ اور آئندہ کی تعمیری جدوجہد میں ہم ان تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

یہ مسائل غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں، اور بغرض افادہ ہم آگے

بڑھنے سے پہلے مباحثِ ماضیہ پر دوبارہ ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔
 حقیقت یہ ہے کہ اسبابِ زوالِ امت کی تشخیص کے معاملہ میں ہمارے
 مورخین نے کچھ ایسا الجھاؤ پیدا کر دیا ہے کہ بہت ہی گہری نظر کے سوا
 اس کا سمجھنا سخت دشوار ہے۔ ہر مورخ نے اپنی افتادِ طبیعت کے مطابق
 اہم اسلامیہ کے اسبابِ عروج و زوال سے بحث کی ہے۔ اور ان کی ایک
 بڑی تعداد ان لوگوں پر مشتمل ہے جنکی نظر نہایت محدود اور سطحی ہے انہوں
 نے دولِ اسلامیہ کے عروج و زوال سے جہاں بحث کی ہے۔ کہیں معاشرتی
 مفاسد و معائب، کہیں معاشی نقائص، اور کہیں علم و فضل کے فقدان
 تک ہی ان کی نگاہ پہنچ سکی ہے۔ ان کی تحریروں سے ہم یہ بات سمجھنے میں
 ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے کہ ان تمام خارجی اور اضافی اسباب کا پس
 منظر یا علتہ العلیل کیا ہے جو ان خارجی اسباب کی تخلیق کرتی ہے۔ اگر
 آج ہم اس حیثیت سے اسبابِ زوالِ امت پر غور کریں تو فسادِ امت
 کے ابتدائی دور سے زمانہ حاضر تک کے تمام مفاسد میں عقلی اور منطقی
 طور پر ربط معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اور اس طرح ہم اپنے ماحول کے مفاسد
 کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

عام انسانی اور بین المللی نقطہ نظر سے ہم اقوامِ دنیا کے اسبابِ
 عروج و زوال کا جائزہ لینا چاہیں تو کم از کم اتنی بات تمام اقوام و ملل
 میں قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے کہ ہر قوم و ملت اپنے افراد کی ذہنی اور
 فکری ہم آہنگی یا اجتماع اور ملی شعور سے اپنی ارتقائی حرکت کا آغاز

کرتی ہے۔ اور جس قدر اس میں غایت اجتماعیہ اور مقصد ملی کی لگن تیز ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی تناسب سے اسکے اعمال میں وحدت و یگانگت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور فکر و عمل کی ایک جہتی سے اسکی سیاست و معیشت اور دیگر مسائل حیات خود بخود سلجھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ غایت اجتماعیہ یا مصلحت کلئیر قوم کے افراد میں ایک گہرا اور پائیدار تعلق پیدا کرتی ہے اور جب تک اس مصلحت کلئیر کا احساس موجود رہتا ہے وہ اسکی خاطر اپنی ذاتی قبیلوی، نسلی، اور خاندانی مصلحتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر اس غایت اجتماعیہ کی محبت کمزور ہو جاتی ہے۔ تو اغراض جزئیہ ابھر سامنے آ جاتی ہیں۔ اور اس سے قوموں کا زوال شروع ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ دنیا کی دوسری اقوام اور ملت اسلامیہ کے تصورات زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے مگر جہاں تک عروج و زوال کے اس عام انسانی تصور کا تعلق ہے۔ مسلمان قوم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یعنی اس کے عروج و زوال میں بھی یہی حقیقت عامہ کار فرما ہے۔ اور اگر ہم اسی نقطہ نظر سے تاریخ اسلامی کے مختلف ادوار کا جائزہ لینا چاہیں تو ان میں یہ بنیادی حقیقت روح کی طرح جاری و ساری نظر آتی ہے جو ان ادوار کے تخریبی عوامل میں ایک طرح کا ربط پیدا کرتی ہے۔

مثلاً سب سے پہلے زمانہ رسالت کو لیجئے۔ اس میں مقصدی شعور اور غایت اجتماعیہ کی افادیت کا اذعان و یقین جسکو قرآنی اصطلاح میں "ایمان" کہا گیا ہے، اتنا بلند، اتنا مستحکم اور اتنا اکل تھا کہ غایات جزئیہ کو اسکے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ زندگی کے ہر مسئلہ کو اس

اجتماعی اور مقصدی نقطہ نظر سے حل کرنا جانتے تھے۔ اُن کے سامنے زندگی کا ایک پاکیزہ اور بلند تر تصور تھا۔ اور ان کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا چلنا پھرنا اسی مقصد کے تابع تھا۔ چنانچہ اس ذہنی اور فکری وحدت نے ان کے اعمال میں حیرت انگیز یگانگت پیدا کر دی تھی۔ نظم و اتحاد تھا تو اسکی بدولت، جذبہ اطاعت تھا تو اسکی وجہ سے، ولولہ ایشار و قربانی اور حیران کن شجاعت و بسالت تھی تو محض اسی یقین کی برکت سے!

خلافت راشدہ کا عہد مجموعی طور پر بلاشبہ علی منہاج النبۃ تھا کیونکہ سیاسی اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں تھا جو فکر و عمل کے لحاظ سے کامل مسلمان تھے۔ اور ان کی موجودگی میں مصالح جزئیہ اور نسلی عصبیت کو بھرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ مگر کچھ طبقوں میں اندر ہی اندر نسلی رقابت کی چنگاریاں سلاگ رہی تھیں جو شہادت عثمانؓ کے بعد پوری قوت سے بھڑک اٹھیں۔ یہ نسلی شعور یا مصلحت جزئیہ دراصل اُس مقصدی شعور کی ضد ہے جو عہد رسالت کے مسلمانوں میں بدرجہ اتم موجود تھا اور اسی سے زوال امت کی ابتدا ہوئی ہے۔

نسلی عصبیت کا نہور چونکہ ملی نسب العین کی عقیدت کے ضعف و انتشار کا نتیجہ تھا۔ اسلئے اسکے ساتھ اور بہت سی ذاتی اغراض اور مصالح جزئیہ کا ہجوم ناگزیر تھا۔ چنانچہ اموی دور کے نظام آمریت و ملوکیت کا قیام و تسلط بھی اسکی وجہ سے ہوا۔ اور پھر آگے چل کر وہ تمام مفاسد

پیدا ہوتے چلے گئے۔ جو لوگوں کے متعلقات و لازعات تھے۔ مثلاً ظلم و تشدد، نظام جاگیر داری، معاشرتی نامساوات، سیاسی اور مذہبی دھڑے بندیاں، امر و سلاطین کی معاشرتی بے اعتدالیاں اور شاہی خاندان کے ارکان میں خود غرضانہ تصادم یہی وہ مفاسد تھے جو بالآخر دولت اموی کی تباہی پر نتیجہ ہوئے۔

دولت عباسیہ بھی عصیتِ جاہلیہ کے ساتھ ظہور میں آئی۔ بلکہ انکی عصیت، امویوں کی عصیت سے شدید تر اور خطرناک تھی یعنی امویوں نے محض اپنی طاقت سے ایک سو سال تک حکومت کی۔ اور انہوں نے فاطمیوں یا عباسیوں کے خلاف باہر سے کسی کی مدد نہیں لی۔ مگر عباسیوں نے امویوں کے اقتدار کو ختم کرنے اور اپنی حکومت کے قیام کے لئے اہل خراسان اور ایرانیوں سے استمداد کی اور پھر انہیں کی کوششوں سے عباسیوں کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دولتِ عباسیہ میں ابتدا ہی سے غیر عرب اور نو مسلم اقوام کا اثر و نفوذ شروع ہو گیا اور اس سے ایک نئے فتنہ کا آغاز ہوا۔ یعنی عربوں کی تہذیب و ثقافت جو اب تک بیرونی اثرات سے بڑی حد تک پاک تھی۔ اب اس پر عجمی اور غیر اسلامی علوم و افکار غالب آنے لگے۔ یہ اتنا بڑا فتنہ تھا کہ اس نے مسلمانوں کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو ایک نئے رخ کی جانب بھیر دیا۔ ایک طرف علماء و مفکرین کا ایک گروہ پیدا ہوا جس نے حکمت قرآنی کے سادہ اور فطری طرز استدلال کو فلسفہ یونان کی موشگافیوں میں الجھا دیا۔ اور

اسلامی تصورات جنگی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی قواعد عمل کے ذریعہ سے تسخیر کائنات کی اپنے اندر کامل صلاحیت رکھتے ہیں۔ فلاطونی تصورات کی طرح بے اثر ہو کر رہ گئے۔ اور دوسری طرف اہل تصوف کا ایک گروہ پیدا ہوا جو ایرانی تصوف، ہندی یوگ، اور ویدانت ازم سے متاثر تھا۔ اس نے عملی زندگی کی کشاکش کے مقابلہ میں گوشہ تنہائی کو ترجیح دی۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کو ذکر و مراقبہ اور قطع علاقہ کی تلقین کی۔ توکل اور تقدیر کا نشہ پلا کر ان کو عملی جدوجہد سے غافل کر دیا۔

بائیں ہمہ دولت عباسیہ کے دور متوسط تک مسلمانوں میں وہ تخلیقی اور جہادی صلاحیتیں موجود رہیں جو کسی قوم کو زمانہ کے جدید مسائل کے حل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ مگر عباسیہ کے آخری دور میں یہ چیز بھی باقی نہ رہی۔

عثمانی سلطنت کا قیام اس وقت ہوا جبکہ اسلامی تہذیب امویوں اور عباسیوں کی مسلسل مصلحت کوششوں اور غرض پرستیوں کی وجہ سے جاں بلب تھی۔ اور دولت عباسیہ کے سقوط کے وقت ملت کا اقتدار سیاست تیرہ مراکز میں تقسیم ہو چکا تھا۔ قریباً ایک سو سال بعد عثمانیوں نے مسند قیادت سنبھالی اور عباسیوں کا پروردہ یونانی فلسفہ، ایرانی تصوف، اور اسی عہد کی فقہ و کلام ہی وہ تہذیبی اور ثقافتی ورثہ تھا، جو انکے ہاتھ لگا۔ اور ترک خود اسلامی فکر و عمل کے اعتبار سے حدیث العہد تھے۔ انہوں نے اسی تہذیبی سرمایہ پر قناعت کی۔ وہ بلاشبہ دلیر، جنگجو، فاتح، ساوہ ذہن اور

اور دیندار تھے۔ مگر ان میں اتنی اجتہادی صلاحیت نہ تھی کہ اسلامی تہذیب کو غیر اسلامی علوم و افکار کی آمیزش سے پاک کرتے۔ اور علوم و فنون کو جدید حالات اور جدید ماحول کے مطابق وسعت دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف ترک تھے جو پرانی لکیر کو پیٹتے چلے آ رہے تھے اور دوسری طرف اقوام مغرب تھیں، جو جدید علوم و فنون کی مدد سے زمین و آسمان کی وسعتوں پر چھا جانے کا عزم کر چکی تھیں۔ جب ان دو قوتوں سے تصادم ہوا تو اس کا وہی نتیجہ ہوا جو کمزور اور طاقتور کے باہم مقابلہ کا ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کی اسلامی حکومتوں میں قریب قریب وہی مفاسد پائے جاتے تھے۔ جو متذکرہ بالا دولِ اسلامیہ میں تھے یعنی ان حکمرانوں کی سیاست ہمیشہ اسلام اور ملت کے عمومی مفاد کے علی الرغم خاندانی اور نسلی مفادات کے گرد جگر کاٹی رہی۔ اور ثقافتی اعتبار سے ان کی حالت ترکوں سے مختلف نہ تھی۔

یہ تو اس وقت کی حالت ہے جبکہ مسلمان کا ملا آزاد تھا۔ اور دنیا میں اسکو اقتدارِ اعلیٰ اور امانتِ اقوام کا منصب حاصل تھا مگر اٹھارہویں صدی میں جبکہ مسلمانوں کے اکثر ممالک اہل مغرب کی محکومی میں چلے گئے تو اس وقت سے اسلامیانِ عالم نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ یعنی اب ایک طرف ان کے قدیم مفاسد تھے۔ جنکو دورِ غلامی نے بچہ تر کر دیا۔ اور دوسری طرف اقوام مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب کے غلبہ و استیلا

نے ان کو ہلاکت آفریں ذہنی اور فکری طوائف الملوک کی میں مبتلا کر دیا

باطنِ این عصر را نہ شناختی

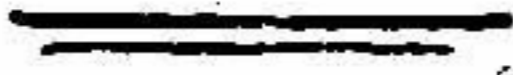
داد اول خویش را در باختی

گذشتہ مباحث سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ملت اسلامیہ

کے تمام مفاسدِ اجتماعیہ کا بنیادی اور حقیقی سبب ان کے اجتماعی

اور ملی شعور کا ضعف و اضمحلال ہے۔ اور اسی سے کئی دوسرے رضائی

اور خارجی اسباب پیدا ہوتے چلے گئے ہیں۔



تعمیر و ارتقاء تمدن کے دو متضاد نظریے

عصر حاضر میں جب تعمیر کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے عام طور پر نہایت سطحی اور محدود معنی مراد لئے جلتے ہیں۔ یعنی معاشرہ کی اقتصادی بد حالی کو دور کرنے کے لئے ایسے ذرائع اختیار کرنا جن سے پیداواری قوتوں میں اضافہ ہو یا ملک کی تعلیمی حالت کو سدھارنے کی خاطر ہر جگہ درسگاہیں کھولنا جس سے ملک کا ہر فرد لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائے۔ اور اس تعمیری جدوجہد کا آخری مقصد یہ ہے کہ ملک کی اجتماعی خوشحالی میں اضافہ ہو۔ کوئی شخص بھوکا اور ننگا نہ رہے۔ اور ملک کا ہر باشندہ اتنا پڑھ لکھ جائے کہ کچھ نہ کچھ اجتماعی شعور اور سیاسی موجدہ بوجہ کے ساتھ ملکی معاملات میں حصہ لے سکے۔

عام طور پر پس ماندہ ممالک میں تعمیر کا مفہوم و مصداق اتنا ہی ہے لیکن زمانہ حال کے ترقی یافتہ اور متہذبن ممالک میں تعمیر کی اصطلاح بھی ترقی یافتہ ہے۔ یعنی ان ممالک کے باشندوں کو چونکہ اقتصادی خوشحالی اور تعلیمی ترقی حاصل ہے۔ اسلئے ان کے سامنے تعمیری پروگرام یہ ہے کہ ملکی صنعت و حرفت کو اتنا فروغ دیا جائے جس سے دنیا کے کمزور اور

پہاں مالک کی دولت زیادہ سے زیادہ مقدار میں سمیٹی جاسکے۔ اور انکے گاڑھے پسینے کی کمائی اپنے ملک کی عیش و نشاط کا سامان بنے یا اس سے وہ تباہ کن اور ہلاکت آفریں آلاتِ حرب تیار کئے جائیں۔ جو انسانی آبادیوں کو چند لمحوں کے اندر تہ و بالا کر دیں۔

تعمیر کے پہلے مفہوم اور دوسرے مفہوم میں صرف مدالرج کا فرق ہے۔ لیکن اصل حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی یہ دونوں مفہوم تعمیر کے مادی تصور پر مبنی ہیں۔ اور پہلا مفہوم اگرچہ کچھ محدود اور بے خطر ہے۔ مگر اسکی تکمیل کے بعد بلازماً دوسرے کی ابتدا ہوتی ہے۔

تعمیر و ارتقا کا مادی تصور مادی تصور تعمیر کا طبعی اور فطری اقتضایہ ہے کہ اس سے انسان کے جسم و روح

کی صلاحیتوں میں توازن قائم نہیں رہتا۔ مادی خواہشات اسکی روحانی طلب و جستجو کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتی ہیں۔ جس سے وہ انسانی شکل و صورت میں جنگل کے درندوں سے زیادہ خوفناک اور سفاک بن جاتا ہے اسکی وحشت و بہمیت سے انسانی آبادیاں ویرانوں اور کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور اسکی سخت دلی اور قسادت قلبی ننھے ننھے بچوں سے انتقام لیتی ہے۔ وہ اس معصوم اور ناکردہ گناہ مخلوق کو چیرنے اور پھاٹنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ عصمت مآب بہو بیٹیوں کی عصمت دری سے وہ اپنے ذوقِ معصیت کو تسکین دیتا ہے۔ اور خدا کی اس کمزور و بے بس مخلوق کے پیٹ چاک کرنے میں اسے مزا آتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ تاریخ

انسانی کی ابتدا سے آج تک انسانیت کو جس قدر ہولناک مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور خدا کی اس زمین پر قتل و غارت۔ وحشت و ہیبتِ ظلم و قہر اور انسانی تباہی و بربادی کے جتنے خونی معرکے آج تک بپا ہوتے رہے ہیں، وہ اسی مادی تصورِ تعمیر و ارتقار تمدن کے کرشمے ہیں جسکو قرآن حکیم فساد فی الارض، علو و استکبار، ضلالت، فسق و فجور، طغیان مکرانسی، اتباعِ ہوائے نفس۔ اور اس قسم کے دوسرے ناموں سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اہم سابقہ کے واقعات و نظائر اسی لئے بیان ہوئے ہیں تاکہ آنے والی انسانی نسلوں کے لئے اُن خطا کار اور مجرم قوم کی راہ فکر و عمل متعین اور واضح ہو جائے۔

وَكذٰلِكَ نَقُصِّلُ الْاٰیٰتِ
وَلتستبين سبيل المجرمين
ہم اسی طرح کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں اور تاکہ خطا کاروں کی راہ عمل واضح اور متعین ہو جائے۔
(الانعام)

— انسان کو ہمہ گیر اصولِ انسانیت اور نوا میں فطرت کی رعایت کے لئے مجبور کرنے والی ایک ہی چیز ہے۔ یعنی اسکی روحانی صلاحیت، جیساں صلاحیت کے مطالبات کو پس انداز کر دیا جاتا ہے تو اس سے ضلالت و غواہت، انسانیت کشی، مساوتِ قلبی، توہینِ آدمیت، خود غرضی، بددیانتی، شورش و بد امنی۔ اور تمام دوسرے مفاہد اجتماعیہ پیدا ہوتے ہیں جن سے خدا کی مقدس زمین فتنہ و فساد سے بھر پور ہو جاتی ہے۔

ظہر الفساد فی البؤ والجر
بر اور بجر خشکی و تری، میں لوگوں کے

بِمَا كَسَبَتْ آيْدِيَ النَّاسِ - اپنے اعمال کی وجہ سے فساد پیدا ہوا
(العنکبوت)

اور آج بھی دنیا کی اقوام میں حسد و رشک کی جنگاریاں سلگ رہی ہیں اور وہ ایک سے ایک بڑھ کر ہلاکت انگیز (سلاح جنگ، زہریلی گیسوں اور تباہ کن آلات حرب کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اسکی وجہ ایک ہی ہو سکتی ہے کہ اقوامِ حاضرہ ہمہ گیر اصولِ انسانیت اور مقدس اخلاقی قدروں (مارل و پیلووز) سے قطعی محروم ہیں۔ جس سے ہر قوم کے شعور میں یہ مادی خواہش کوٹھیں لے رہی ہے کہ وہ پوری زمین کی وسعتوں پر چھا جائے۔ اقوامِ عالم کی قیادت و سیادت اسی کو حاصل ہو۔ اور دنیا کے تمام ممالک میں اسکی ملکی مصنوعات کی زیادہ سے زیادہ کھپت ہو گو اس مقصد کے حصول کی راہ میں اسے انسانی کھوپڑیوں کو روندنا، آبادیوں کو نذر آتش کرنا، اور بے گناہوں کے خونِ ناحق میں تیرنا ہی کیوں نہ پڑے۔

مگر کیا یہ مادہ پرست اور خود غرض قومیں فساد و استکبار اور تخریب انسانیت کے قدرتی نتائج سے بچ سکتی ہیں؟ اس کا جواب آپ کو قرآن حکیم ہی سے مل سکتا ہے

اِنَّ يَكْسِفُ اللّٰهُ بِهٖمُ الْاَرْضَۃَ
اَوْ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ
كِيَا بے خطر ہو گئے ہیں وہ لوگ، جو بری
تدبیریں کرتے ہیں اس بات سے کہ دھنکے
اللہ تعالیٰ انکو زمین میں یا آہنیچے انکو

لَا يَشْعُرُونَ - أَوْ يَأْخُذُهُمْ
فِي تَقْلِبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ
أَوْ خُذَهُمْ عَلَى تَخَوُّفٍ - فَإِنَّ
رَبَّكُمْ لَرَوْفٌ رَحِيمٌ -

(النحل)

وَسَكَنْتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ
ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ
كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا
لَكُمْ الْأَمْثَالَ -

(سورہ ابراہیم)

قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
فَاتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَارِئِ
فَحَرَّبْنَا عَلَيْهِمُ السَّقْفَ مِنْ فَوْقِهِمْ

(النحل)

عذاب اس جگہ سے کہ وہ نہیں جانتے
یا پکڑ لے ان کو چلتے پھرتے۔ پس وہ خدا
کو عاجز کرنے والے نہیں ہیں یا ان کو خوف
کی حالت میں پکڑ لے۔ بے شک تمہارا رب
بڑا شفیق اور مہربان ہے۔

تم ان لوگوں کے گھروں میں سکونت
کرتے ہو جنہوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور
تمہارے لئے ظاہر ہو چکا ہے کہ ہم نے ان
ظالم لوگوں سے کیا سلوک کیا۔ اور ہم نے
تمہارے لئے مثالیں بیان کر دی ہیں۔

ان لوگوں نے بھی مکر کیا جو ان سے پہلے
گذر چکے ہیں۔ پس آیا اللہ کا عذاب ان کے
مکانوں کی بنیادوں سے۔ پس گر پڑی ان
پر چھت ان کے اوپر سے۔

ان آیات قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت کا عمل مکافات اس
دنیا میں بھی برابر کار فرما رہتا ہے۔ اور اقوام دنیا اپنے نیک یا بد جنماعی
کردار کی وجہ سے فلاح و سعادت یا ہلاکت و بربادی کا ثمرہ پاتی ہے۔
خدا کے قدوس چونکہ ظلم و نا انصافی سے پاک ہے اس لئے یہ بات ہرگز ممکن
نہیں ہے کہ وہ نیک قوموں کو مقام سعادت و شرف سے محروم رکھے

اور بری قوموں کو ان کے خلاف فطرت اور ننگِ آدمیت اعمال کی سزا
 نہ دے یا ان دو قسم کی قوموں سے ایک جیسا سلوک کرے۔

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا
 وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ
 فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ
 كَالْفَجَّارِ -

کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں
 اور اچھے کام کرتے ہیں ان لوگوں کے برابر
 رکھیں گے جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں
 یا متقین کو فجار کے برابر رکھیں گے؟

(سورہ زمر)

کیا جو شخص مومن ہے اس شخص کی طرح ہے
 جو فاسق ہے۔ یہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔
 کیا جو شخص کہ مردہ تھا، پس ہم نے اسکو
 زندہ کیا اور اسکے لئے نور پیدا کیا جس سے
 وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس شخص کی
 طرح ہے جو اندھیروں میں گم ہے۔ اور ان کے
 نکلنے کی قدرت نہیں رکھتا؟

أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ
 فَاسِقًا. لَا يَسْتَوُونَ (البحرہ)
 أَوْ مَيِّتًا كَانَ مَيِّتًا فَأَحْيَيْنَاهُ
 وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي
 النَّاسِ كَمَنْ مَثَلَهُ فِي الظُّلُمَاتِ
 لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا -

(الانعام)

ہمیں اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ ان باتوں کو محض مذہبی تقدس
 کی بنا پر تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ ہم اصحابِ فہم و بصیرت کو دعوت دیتے
 ہیں کہ وہ عقل و دانش اور تاریخی واقعات و نظائر کی روشنی میں اس مسئلہ
 پر گہری نگاہ ڈالیں کہ کیا قرآن حکیم نے انسانی فلاح و سعادت اور مسائل
 زندگی کا جو حل پیش کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے؟ اور کیا اقوامِ حاضرہ کے

اجتماعی اعمال فساد و تخریب میں ان تاریخی اقوام جیسے نہیں ہیں، جو اپنی بد اعمالیوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے قدرت کے قانون مکافات کی زد میں آئیں؛ اور کیا اس مادہ پرستی اور خود غرضانہ رجحانِ عملِ عسلی کا طبعی نتیجہ وہی نہیں ہے جو قرآن حکیم نے متعدد مرتبہ بیان کیا ہے؛ اگر عقل و تامل بھی اس معاملہ میں قرآن کے ہمتیاء ہیں اور خود ان اقوام کا مشاہدہ اور عملی تجزیہ بھی اس بات کی بین شہادت ہے کہ ان کی مادہ پرستی ان کو ہلاکت و بربادی کے جہنم کی طرف کشاں کشاں لے جا رہی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اسی پر خطرہ راستہ پر سرپٹ دوڑی جا رہی ہیں۔ اور وہ کون سی چیز ہے جس نے ان قوموں کو نیک و بد کی تمیز سے محروم کر دیا ہے۔ اور اب تک اسی کردہ اور بھیاناک اجتماعی کردار کو خوبصورت ہی سمجھتا ہیں؛ یہ چیز وہی ہے جس کو قرآن عزیز نے "تزوین شیطان" سے تعبیر کیا ہے۔

اور ہم نے رسول بھیجے پہلی قوموں کی

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّنْ

طرت۔ پس ہم نے (انکے کفر و انکار پر)

قَبْلِكَ فَآخَذْنَا هُم بِالْبِئْسَاءِ

ان کو مصیبت و درد میں مبتلا کیا، تاکہ وہ

وَالضَّرَّاءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّحُونَ

عاجزی کریں۔ پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ

فَلَوْلَا إِذْ جَاءَهُمْ بَأْسُنَا تَضَرَّعُوا

جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو وہ جھک

وَلَكِنْ تَسْتَكْبِرُونَ وَلَهُمْ ذُرِّيٌّ

جاتے۔ لیکن ان کے دل سخت ہو گئے تھے

لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا

اور شیطان نے ان کے اعمال کو انکی نظر میں

يَعْمَلُونَ۔ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا

خوبصورت بنا دیا تھا۔ پس جب وہ اس

بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمُ أَبْوَابَ كُلِّ

كُنِيَ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا
أَخَذُوا لَهُمْ بَعْتَهُ فَاذَا هُمْ
مُبْلِسُونَ -

(الانعام)

پیغام کو بھول گئے۔ جس سے ان کی تذکیر
کی گئی۔ کھول دیئے ہم نے ان پر ہر چیز دولت
ورزق کے دروازے یہاں تک کہ جب وہ
ان دی ہوئی چیزوں پر خوش ہونے لگے تو
ہم نے ان کو ناگہانی بکڑ لیا۔

هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ
أَعْمَالًا - الَّذِينَ خَلَقْنَا سَعِيدًا
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ
أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا -

(الکہف)

کیا ہم آپ کو ان لوگوں کا حال بتائیں
جو اعمال میں نقصان اٹھانے والے ہیں
یہ وہ لوگ ہیں جنکی کوشش حیات دنیوی
میں گم ہو گئی ہے۔ اور وہ یہ سمجھ رہے
ہیں کہ ہم اچھا کر رہے ہیں۔

اگر اس مسئلہ پر کچھ گہری نظر سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت از خود ہی
اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ زندگی کا مادی تصور اپنی طبیعت اور مزاج سے
انسانی افراد و جماعات میں حسد و رشک، بغض و عناد، علو و استکبار،
زینت و تجمل کی خواہش، خود غرضی، جذبہ تذلیل انسانیت۔ اور تمام
معاشرتی و معاشی مفاسد پیدا کرتا ہے۔ اور اس سے انسانی قلوب میں
باہم نفرت و کدورت، معاشی و سیاسی برتری کی مجنونانہ خواہش روز
افزوں بڑھتی ہی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسی مادہ پرست اقوام مشرق و مغرب
کا معیار ہی کثرت دولت، قوت و شوکت کی نمائش، اور حسن و تجمل کا اظہار
ہوتا ہے۔ اور انکی نظر میں وہ تمام لوگ ذلیل ہوتے ہیں جو انکے خود ساختہ

معیارِ شرف پر پورے نہ اترتے ہوں۔ قرآن حکیم نے ان لوگوں کے رجحانِ طبیعت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

مَا أَرْسَلْنَا فِي قُرَيْبَةٍ مِّنْ
نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِهَا
أَرْسَلْنَا بِهٖ كَافِرُونَ - وَقَالُوا
لَنَحْنُ الْكُفْرُ الْمَوْلَاةُ وَأَوْلَادُهَا
لَنَحْنُ بِمَعَدِّ يَتِينَ -

(الباق)

وَنَادَى فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهٖ
يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَ
هَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي
أَفَلَا تُبْصِرُونَ - أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ
هَٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ وَلَا يُكَادُ
يُبِينُ -

(الزخرف)

ہم نے جب بھی کسی لہستی میں پیغمبر بھیجا تو
اسکے خوشحال اور دولت مند لوگوں نے
کہہ دیا کہ ہم اس پیغام کا انکار کرتے ہیں۔
جو آپ لیکر آئے ہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ
ہم مال و اولاد میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں
اور ہم کو عذاب نہیں ہوگا۔

فرعون نے اپنی قوم میں یہ آواز بلند کی
اے میری قوم! کیا میرے لئے مصر کی حکومت
نہیں ہے اور یہ نہریں ہیں جو میرے نیچے
سے بہ رہی ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ کیا
میں اس شخص سے (حضرت موسیٰ) بہتر
نہیں ہوں جو ذلیل ہے اور اچھی طرح کھل

کر بات بھی نہیں کر سکتا ہے

تعمیر و ارتقاء کا قرآنی تصور

حیاتِ انسانی کی حرکت ارتقاء میں اگر روحانی
اور جسمانی قوتوں کو ساتھ ساتھ بڑھانے کا
موقع دیا جائے تو اس سے جو صالح اور بے ضرر نظام تمدن معرضِ وجود
میں آتا ہے۔ اس میں صرف اتنا ہی نہیں کہ جماعتِ انسانی مادی لحاظ سے

خوشحال اور علم و فن کی مدد سے کائنات کی تخریب کا دور ہوتی ہے۔ بلکہ اسکے ساتھ وہ احترام آدمیت، اُنس و محبت، دیانت و صداقت، تقویٰ و طہارت، اور دیگر اعلیٰ و پاکیزہ صفات کی بھی حامل ہوتی ہے۔ اس معاشرہ میں ہر فرد کو مساوی طور پر آگے بڑھنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ اور جماعت کے تمام افراد ایک کنبہ کی طرح دکھ درد میں ایک دوسرے کے شریکِ حال ہوتے ہیں۔ کسی کو کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہاں ظلم و نا انصافی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ ایک کی مصیبت سب کی مصیبت ہوتی ہے۔ نیز اس معاشرہ میں زمیندار اور کسان یا کارخانہ دار اور مزدور کی تقسیم ہے اور نہ معاشرتی طور پر اونچ نیچ کا امتیاز ہے۔ بلکہ تمام افراد جماعت میں اخوت انسانی کا مقدس جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ تعمیر و ارتقاء تمدن کا قرآنی تصور اقوام دنیا کے مادی تصورِ تعمیر کی طرح ناقص اور ادھورا نہیں ہے کہ نفس و روح کی پاکیزہ صلاحیتوں کا غافل ہو اور جسم و مادہ کی خواہشات کو بے لگام چھوڑ دے۔ بلکہ وہ انسان کی تمام روحانی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے ایک متوازن، اور معتدل نظامِ تمدن اور پاکیزہ و بے ضرر معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم ارسالِ رسل اور انزالِ کتب کا مقصد ہی یہ بیان کرتا ہے، کہ جب کسی انسانی جماعت کا اجتماعی کردار بگڑ جاتا ہے اور وہ نقطہ اعتدال سے دور ہٹ جاتی ہے تو خدائے قدوس اسکے نظامِ اجتماع و تمدن میں توازن قائم کرنے کے لئے انبیاء و رسل کو بھیجتا ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ
وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ
(المحذید)

بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل برہان
کے ساتھ بھیجے۔ اور ان کے ہمراہ ہم نے
کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ (غلط
راہوں سے ہٹ کر) نقطہ (اعتدال پر کھڑے
ہو جائیں۔

انسانی جماعت میں جب بھی فساد و اختلال رونما ہوا۔ اسکا بنیادی
سبب انسانی تاریخ میں ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ یعنی سب سے پہلے اس کے
اندازِ فکر میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ زندگی کے اہم اور ضروری تقاضوں
سے اسکی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ اور محض خرافات و اہام یا مادی خواہشات
کو اپنا کعبہ مقصود بنا لیتی ہے۔ اس طرح بہ تدریج اسکی زندگی کا نقطہ نظر
بالکل بدل جاتا ہے۔ اور یہیں سے اسکے نظام تمدن میں بد نظمی اور
بد اعتدالی کا ظہور ہوتا ہے۔ اور پھر آگے چل کر اس کا یہ نیا نظریہ تمدن
اتنا گہرا اور اتنا پختہ ہو جاتا ہے کہ اب اس میں نیک و بد اور غلط و صواب
کی تمیز کی قوت ہی مفقود ہو جاتی ہے۔ اور وہ خدا کے بھیجے ہوئے مقدس
انبیاء و رسل کی دعوتِ اصلاح و تعمیر کا مذاق اڑاتی ہے۔ اور اپنے مادی
تفوق کو اپنے نظریہ زندگی کی صداقت کے لئے بطور سند پیش کرتی ہے۔

اہل کفر نے اہل ایمان سے کہا، اگر اسلام
کوئی بہتر چیز ہوتی تو یہ لوگ اس میں ہم
سبقت نہ لے جاتے۔ اور جب ان کو

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ
آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا
إِلَيْهِ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ

فَسَيَقُولُونَ هَذَا افْكٌ قَدِيمٌ

اسکی ہدایت میسر نہیں آسکی تو یہ کہیں گے

کہ یہ پرانا جھوٹ ہے۔

(حم)

وَقَالُوا لَنْ نَمُنَّ بِالْآثَرِ الْمَوَالَا

انہوں نے کہا کہ ہمال و اولاد میں بڑھے

ہوئے ہیں اور سبکو عذاب نہیں ہوگا۔

وَأُولَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ

بلکہ انبیا و رسل کے مقابلہ میں اپنے علم و فہم اور عقل و دانش پر اترانا شروع کر دیتے ہیں۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ

پس جب ان کے پاس ان کے رسول

واضح دلائل کے ساتھ آئے تو وہ اپنے

علم و عقل پر اترانے لگے۔

بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ

مِنَ الْعِلْمِ۔ (المومن)

جیسا کہ آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ عصر حاضر میں علم و فن اور سائنس

کی حیرت افزا وسعت و ترقی نے انسان کو انسانیت و اخلاق اور مذہب

و روحانیت کی تمام اعلیٰ قدروں سے منحرف کر دیا ہے۔ اور اپنے علمی و

سائنسی اکتشافات پر ہی نازاں ہیں۔ وہ اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ

انسانی عقل ہی عقیدہ زندگی کو حل کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور جو باتیں ان

کے فہم و عقل کی حد رسائی سے بالاتر ہیں، وہ علم و سائنس کے اس سائنسی

دور میں ناقابل تسلیم ہیں۔ مگر آج انکی علمی اور عقلی کاوشوں کے نتائج ہمارے

سامنے ہیں۔ قیام امن اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے ان کی تمام تدبیریں

بے اثر اور ان کے تمام منصوبے ناکام رہتے ہیں۔ بلکہ انکی سائنسی تدبیر مدہانتی

الہیہیں پیدا کر رہی ہے۔ اور ہر نئے منصوبہ سے نئے نئے فتنوں کی بھرمار

شروع ہو جاتی ہے۔ اور پھر وہ نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو چاروں طرف یاں
و نو میدی کی تیر و تار گھٹائیں ان کے سروں پر منڈلا رہی ہوتی ہیں۔ اور
اس طرح ان کی سالہا سال کی محنت چند لمحوں میں ضائع ہو جاتی ہے ایسا
کیوں ہوتا ہے؟

ذَالِكِ بِأَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا
أَسَٰخَطَ اللَّهُ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ
فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ۔
(سورہ محمد)

اسلئے کہ جس چیز کو خدا ناپسند کرتا ہے
یہ لوگ اسکا پیچھا کرتے ہیں اور جس چیز کو
خدا پسند کرتا ہے، اسکو وہ برا سمجھتے ہیں
پس اللہ تعالیٰ ان کے کئے کرائے کو ضائع
کر دیتا ہے۔

چونکہ انسانی جماعتوں کا اجتماعی فساد ان کے طریق فکر سے شروع
ہوتا ہے۔ اسلئے انبیاء علیہم السلام کی انقلابی دعوت پہلے قلوب و اذہان
ہی سے ابتدا کرتی ہے۔ اور اسکے بعد خارجی احوال و مشغولوں کی اصلاح
اور نظام تمدن کی تعمیر کا کام پایہ تکمیل کو پہنچاتا ہے۔ پہلے عمل کا نام تطہیر
فکر اور تزکیہ نفس ہے۔ اور دوسرے کا نام تعمیر ہے۔ پہلے عمل کے سوا دوسرا
عمل کبھی پائدار اور مستقل نتائج نہیں پیدا کرتا، اور نہ ہی وہ فلاح انسانیت
پر منتج ہوتا ہے۔ بلکہ وہ انسانوں کو ایک مصیبت سے نکال کر اس سے
بڑی مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔

کیا وہ شخص جو بنیادیں اٹھائے اپنی
عمارت کی اللہ کے خوف اور اسکی رضامندی

أَقْمِنَ أَسَٰسَ بُنْيَانِهِ عَلَىٰ
تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٍ

بہتر ہے۔ یا وہ شخص جو بنیادیں اٹھائے
اپنی عمارت کی گرنے والی رو و خورہ زمین
کے کنارہ پر، پس لے کرے اسکو بھی رونج
کی آگ میں۔ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو
ہدایت نہیں کرتا۔

وہ شخص فلاح پاتا ہے جس نے نفس کو
پاک و مطہر کر لیا۔ اور وہ ذلیل و رسوا
ہوتا ہے جس نے نفس کو گندگی سے آلودہ کیا۔

حقیقی انقلاب کے معنی ہی یہ ہیں کہ انقلاب کے بعد کی زندگی پہلے
سے بالکل جدا اور مختلف ہو جائے۔ اور قوم فکر و عمل کے اعتبار سے ایک
نئے سانچے میں ڈھل جائے۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے کہ انقلابی جدوجہد
قلوب و اذہان کی تطہیر سے شروع ہو۔

پس نخستیں باید شش تطہیر فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیر فکر

ام من اسس بنیانہ عدل شفا
جرف ہا ہا فانا ہا بہ فی نار
جھنڈا، واللہ لا یھدئ القوا
الظالمین۔

(التوبہ)

قد افلح من تراکھا وقد
خاب من دشاھا۔

(سورہ شمس)

پیغمبرانہ دعوتِ انقلاب

اور اسکے حصول و مبادی

فنِ سرجری کا ماہر ڈاکٹر جب جسم کے ناسور کا اپریشن کرتا ہے تو اسکی تمام تر توجہ دو باتوں میں سمٹ جاتی ہے۔ ایک یہ کہ جسم کا کوئی صالح اور صحت مند حصہ اسکے عملِ جراحی کی زد میں نہ آجائے۔ اور دوسرے یہ کہ متعفن اور سمیت آلودہ مادہ کا کوئی ذرہ جسم کے اندر باقی نہ رہ جائے جسکے جراثیمی تعدیہ سے جسم کے دوسرے حصے متاثر ہو جائیں جو ڈاکٹر ان دو باتوں یا ان میں سے کسی ایک سے بے اعتنائی کرتا ہے، وہ مریض کو اس ہلاکت آفریں مرض کے چنگل سے بچانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔

- حضراتِ انبیا علیہم السلام کو مریض معاشرہ انسانی کے علاج کے لئے خلد کی طرف سے بھیجا جاتا ہے۔ اور ان کی دور رس نگاہ پہلے مرحلہ پر ہی معاشرہ کے تمام فکری، ذہنی، روحانی اور عملی اسقام و مفاسد کا جائزہ لیتی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے وہ تمام خارجی مفاسد کے اصل سرچشمہ یعنی لادینی رجحانِ فکر کی ٹوہ لگاتے ہیں۔ جس سے تمام عملی مفاسد بھوٹ بھوٹ

کرنہکتے ہیں۔ اور اسکے بعد معاشرہ کے خارجی احوال و شئون کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اسکی معیشت و معاشرت اور سیاست و اجتماع کے طرز و طریق میں جہاں جہاں ان کو خرابی نظر آتی ہے اسکو چن چن کر سامنے لاتے ہیں۔ اور اسکی اصلاح و تبدیلی میں پوری قوت صرف کرتے ہیں۔ اور پہلے سے جو اچھی چیزیں اس میں موجود ہوتی ہیں، ان کو جوں کاتوں باقی رکھا جاتا ہے۔ پیغمبرانہ دعوت انقلاب کے اس اصولی طریق کار سے ایک صالح، صحت مند، مہذب اور مثالی معاشرہ انسانی معرض وجود میں آتا ہے۔

تنظیم جماعت | پہلے مرحلہ پر نبی کا کام انسانی قلوب کو وساوس و ادھام اور شکوک و شبہات سے پاک کر کے

ان کو ایک مقدس تر اور واضح تر اخلاقی مقصد حیات سے متعارف کرنا اور بتدریج انکے رجحان فکر اور شعور ذہنی میں تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ جو لوگ اس نئی انقلابی جماعت کے رکن بنتے ہیں ان کو پہلے ہی دن یہ بتا دیا جاتا ہے کہ ابھی سے تمہیں زندگی کا نقطہ نظر بدلنا ہو گا۔ فکر و ذہن میں تبدیلی پیدا کرنی ہو گی۔ اور اس جاہد تصور زندگی کے مطابق اپنی سیرت کو ڈھالنا ہو گا۔ اس آئینی معاہدہ (بیعت) سے وہ جماعت مسلمہ کی رکنیت اختیار کرتے ہیں۔ اور اس طرح چند پاکیزہ نیک سیرت اور بالغ النظر انسانوں کی ایک مختصر سی جماعت تیار ہو جاتی ہے جو اپنے اعلیٰ کردار اور حسن عمل کی کشش سے بڑے بڑے مغرور اور متکبر انسانوں

کو اپنی طرف کھینچ لاتی ہے۔

تظہیر فکر اور تعمیر فکر کے اس دو گونہ اسوۂ نبوت کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

کَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا
مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ
(البقرہ)

جیسا کہ ہم نے تم میں ہی سے رسول بھیجا
جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔ تمہارے
دلوں کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور تمہیں کتاب و حکمت
کی تعلیم دیتا ہے۔ اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا
ہے جو تم اس سے پہلے نہیں جانتے تھے۔

یعنی تزکیہ نفس اور تظہیر فکر کے بعد "الکتاب والحکمہ" وہ تعمیری لائحہ
عمل ہے جس سے فکر و عمل اور سیرت و کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔

خود نبی کو اپنے مقصدِ حیات سے نہایت
اخلاص مقصد اور تخلیق یقین

انگہری عقیدت ہوتی ہے۔ نیز اسکو اس
بات میں غیر متزلزل یقین ہوتا ہے کہ حیات انسانی کے تمام مسائل صرف
اسی نظریہ زندگی کے توسط سے حل ہو سکتے ہیں جو خدا کی طرف سے اُسکو
ملا ہے۔ اسلئے وہ پورے عزم و ایمان کے ساتھ لوگوں کے سامنے اسکا اعلان
کرتا ہے۔ مصائب و آلام کی آندھیاں آتی ہیں۔ رنج و بلا کے طوفان اٹھتے
ہیں۔ کہیں قتل کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ اور کہیں جلا وطنی کے منصوبے ہوتے
ہیں۔ قوم کا بچہ بچہ جانی دشمن بن جاتا ہے۔ گالیوں اور طعنوں کی ہر طرف سے
بوچھاڑ ہوتی ہے۔ مگر نبی کے عزم و ارادہ کا یہ حال ہے کہ وہ پہاڑ

کی طرح اپنی جگہ پر کھڑا ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبْتَ مِنْ قَبْلِكَ
فَصَبِرْ وَاعْلَى مَا كَذَّبُوا وَأَوْذُوا
حَقًّا أَنَّهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ
لِكَلِمَاتِ اللَّهِ، وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ
نَبِيٍّ الْمُرْسَلِينَ -

آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا
پس انہوں نے جھٹلائے جلنے اور اذیت
دیئے جانے پر صبر کیا یہاں تک کہ ان کو
ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کے فیصلوں کو
کوئی تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔ اور بلاشبہ

(الانعام)

رسولوں کے واقعات آپ تک پہنچ چکے ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے ایمان و یقین کا اس سے اندازہ کیا
جا سکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کی مسلسل ایذا رسانی، پیہم
تکذیب و تضحیک اور اپنی تنہائی و بے سرو سامانی کے باوجود ان الفاظ میں
اپنے عزم و یقین کا اعلان کرتے ہیں۔

يَقَوْمِ إِن كَانَ كِبُرٌ عَلَيْكُمْ
مَقَامِي وَتَذَكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ
فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ
وَشُرَكَاءَ كُمْ تَم لَّيْلُنَ أَمْرَكُمْ
عَلَيْكُمْ حَمَّةٌ تَم أَقْضُوا إِلَيَّ
وَلَا تُنظِرُون -

اے میری قوم! اگر میرا منصب اور میرا
تم کو نصیحت کرنا، اللہ کی آیات سے تم پر
گراں گزرتا ہے، تو میں صرف اللہ پر بھروسہ
کرتا ہوں۔ پس تم اپنے معبودوں کو ساتھ لیکر
اپنے معاملہ کو ٹھیک کر لو۔ تمہارا معاملہ تم پر
مشتبہ نہ رہے۔ پھر تم میرا فیصلہ کرو اور

(یونس)

مجھے مہلت نہ دو۔

آنحضرت صلعم نے اپنی تیرہ سالہ عمر کی زندگی میں قریش کے ہاتھوں جو منظم

ہے ان کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسا کون ہوگا، جس نے اتنی طویل مدت تک ایسے کینہ پروردشمنوں میں رہ کر مسلسل جگر خراش آرام و مصائب برداشت کئے ہوں۔ مگر ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا دامن صبر ہاتھ سے نہ چھوٹا ہو۔ اتنا ظلم و تشدد کہ خود خداوند تعالیٰ آپ کے مصائب کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں۔

لَوْلَا أَنْ تَبَيَّنَّاكَ لَفَتَدُّ
كَذَّبْتَ تَرْكُنُ إِلَيْهِمْ شَيْعَاءٌ
اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ
کچھ نہ کچھ ضرور ہی ان کی جانب جمع
قلیلاً۔

حق یہ ہے کہ یہ عشق و مستی کا وہ مقام ہے جہاں جسمانی اذیتوں اور حوصلہ شکن مصائب کا بطیب خاطر استقبال کیا جاتا ہے۔

عشق بازی را تحمل باید لے دلِ عشق باز
گر بلائے بود بود و گر خطائے رفت رفت

آپ جس سرزمین میں رہتے ہیں وہاں ہر طرف سے آپ کی دعوت میں رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ آپ کا اور آپ کے پیروں کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا جاتا ہے کہ دیکھو ان کا حال کیا ہے کہ کھانے کو روٹی نہیں ہے اور پینے کو پھر نہیں ہے۔ اور ان کی باتیں سنو تو روئے زمین کی حکومت و خلافت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ غرض قدم قدم پر روح فرسا اور ہمت شکن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مگر دشتِ بلا کی ہر ٹھوک سے ان کے عزم و ایمان میں پختگی اور قدم ہمت میں ثبات و استقلال پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔

وادی عشق اگر دور دراز ہست دے

طے شو و جادہ صد سالہ بہ آہے گا ہے

نبی کا سینہ ابتدا ہی سے نور ایمان سے منور ہوتا ہے۔ لیکن اہل زمانہ کے عمل و کردار کی ظلمت جس قدر تیز اور گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی قدر اسکی نگاہ حقیقت شناس نمودِ صبح کی جلوہ پاشیوں کو قریب تر دیکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کو تحملِ شانہ سے دکھ نہیں ہوتا۔ بلکہ لذت محسوس ہوتی ہے۔

بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہی ہے۔ اور پھر اس قول پر مضبوطی سے ڈٹ گئے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (جو ان سے یہ کہتے ہیں) ڈرو نہیں اور نہ غم کھاؤ، اور جس جنت کا وعدہ تم سے کیا گیا ہے اس پر خوشی مناؤ۔ ہم دنیا اور آخرت میں تمہارے مددگار ہیں۔ اور تمہارے لئے جنت میں وہ سب کچھ ہو جسکی تم خواہش رکھتے ہو اور جو کچھ تم مانگتے ہو، یہ بخشنے والے اور رحم کرنے والے خدا کی طرف سے مہمانی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ
ثُمَّ اسْتَعْمُوا فَتَنَّا عَلَيْهِمُ
الْمَلَائِكَةَ أَنْ لَا تُخَافُوا وَلَا
تَحْزَنُوا وَابْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي
كُنْتُمْ تُوعَدُونَ - نَحْنُ أَوْلِيَاكُمْ
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ
وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهُى أَنْفُسُكُمْ
وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ - نَزَّلْنَا
مِنْ سَفْوَرٍ رَاحِمِينَ -

حضرت جناب، جناب رسالت مآب صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر

رنج و آلام کا شکوہ اور آپ سے دعا کی درخواست کرتے ہیں۔ آپ ان ستم رسیدہ اور مظلوم انسانوں کو یوں خطاب کرتے ہیں۔

قال کان الرجل فی منکان
قبلکم یخفر له الارض فیجعل
فیه فیجاء بالمنشار فیوضع علی
رأسه فینشق وما یصدہ
ذالک عن دینہ ویشط بالمشا
الحدید ما دون لحمہ من عظم
وعصب وما یصدہ ذالک عن
دینہ۔ واللہ لیتمن هذا الا
حتى یسیر الراء کب من صنعا
الی حضر موت لا ینحاف الا للہ
ولکنکم تستعجلون۔

(البخاری)

تم سے پہلے ایسے لوگ ہو گئے ہیں، کہ
کہ زمین میں گڑھا کھود کر ان کو اس گڑھے
میں لٹا دیا جاتا اور پھر انکے سر پر آرا لگا کر
انکو چیر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ آزمائش انکو
دین سے نہ پھیر سکتی تھی۔ ان کے جسم میں
لوہے کی کنگھی کے دندانے اس طرح چبھوئے
جاتے کہ وہ گوشت سے نیچے اتر کر ہڈی اور
ٹپھوں کو چھلنی کر دیتے تھے۔ لیکن یہ مصیبت
بھی ان کو راہ حق سے نہ پھیر سکتی تھی خدا
کی قسم یہ امر (اسلام) مکمل ہو کر ہے گا اور
(اس طرح ہمہ گیر امن قائم ہوگا) کہ سوائے
صنعا سے حضر موت تک چلا جائیگا اور
اسکو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ لیکن

تم بہت جلدی کرتے ہو۔

یہ تو خود انبیا علیہم السلام کا حال ہے۔ لیکن جو لوگ سچے دل سے
حضرات انبیا پر ایمان لاتے ہیں، ان کو بھی کچھ ایسا ہی ذوق یقین حاصل
ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد حیات کی راہ میں پیش آنے والی بڑی سے بڑی

آزمائش کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ کلمہ حق کے اعلان و اظہار میں اتنے بے باک ہوتے ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے مغرور و متکبر انسان ان کی نگاہ میں نہیں جھٹکتے۔ اور وہ بے خوف و خطر ان کے پرہیزگاریوں میں گھس جاتے ہیں۔ اور ان کی نگاہ ایمانی سے ان ظالم و جابر حکمرانوں کے پر شکوہ تخت و سریر لڑاٹھتے ہیں۔

باسلاطیں درفتند مرد فقیر

از شکوہ بویا لرد سیر

ان کی ضرب لا الہ سے بتان باطل ریزہ ریزہ اور ان کے ہاتھوں سے ارباب اقتدار کی قبا کہنہ چاک چاک ہو جاتی ہے۔

ریزہ ریزہ از ضرب اولات و منشا درجہات آزاد از بندجہات

ہر قبائے کہنہ چاک از دست او قیصر و کسری بلاک از دست او

مصر کا مغرور اور متکبر بادشاہ اپنے تمام لاؤ لشکر کے ساتھ کھڑا ہے

اسکی ہیبت و شوکت سے لوگوں کے دل زلزلے میں ہیں۔ نظریں سہمی ہوئی

ہیں۔ رگوں میں خون خشک ہو رہا ہے۔ اور کسی کو اسکے سامنے لب کشائی

کی جرأت نہیں ہے۔ اس حالت میں اسکی نگاہ غرور اٹھتی ہے۔ اور وہ اپنی

قوم کو یوں خطاب کرتا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذُرُونِي أَقْتُلْ

مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَجُلًا مِنِّي

أَخَافُ أَنَّ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ أَوْ

فرعون نے کہا کہ مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰ

کو قتل کر دوں، اور وہ اپنے رب کو پکالے،

مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دیگا

أَنْ يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَادَ - یا وہ زمین میں فساد کھرا کرے گا۔
 اس اجتماع میں فرعون ہی کی قوم کا ایک خدا شناس انسان بھی موجود
 تھا جو اگرچہ پہلے سے نور ایمان سے منور ہو چکا تھا، مگر اس سے پہلے اس نے
 اپنے ایمان کو ظاہر نہ کیا تھا۔ فرعون کے ان پر غرور الفاظ کے بعد وہ ضبط
 سخن نہ کر سکا۔ اب اسکے لئے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ جس نظریہ زندگی کو
 صحیح سمجھتا ہے اسکو دل ہی میں چھپائے رکھے۔ اور زبان سے اسکا اظہار
 و اعلان نہ کرے۔ یہ وقت بڑا ہی نازک تھا۔ فرعون کی ایک جلسہ زبان
 سے اس کا سر قلم کئے جانے کا خطرہ تھا۔ اور وہ بھی جانتا تھا کہ اس وقت
 حضرت موسیٰ کا ساتھ دینا فرشتہ موت کو دعوت دینا ہے۔ مگر اس کی
 جلسہ ایمانی نے اسکو کچھ اس طرح بے قرار و مضطرب کر دیا کہ فرعون
 کی حشمت و جاہ اور جلال و شکوہ اسکو مرعوب نہ کر سکا۔ چنانچہ یہ مرد
 مومن اس موقع پر کھڑا ہو کر فرعون اور اسکی قوم کو خطاب کرتا ہے۔

أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ
 رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ
 مِنْ رَبِّكُمْ وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ
 كَذِبُهُ، وَإِنْ يَكُ صَادِقًا
 يُصِيبْكُمْ بِبَعْضِ الَّذِي يَعِدُكُمْ
 إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِئٌ
 مُرْتَابٌ -

کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہو
 جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار صرف اللہ ہے
 اور وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے
 واضح دلائل و براہین لیکر آیا ہے۔ اگر وہ
 جھوٹا ہے تو اسکے جھوٹ کا وبال اسی پر پڑے گا
 اور اگر سچا ہے تو تم پر اس عذاب الہی کا کچھ
 حصہ ضرور ہی آپڑے گا جس کا وہ تم سے وعدہ

کرتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ اس شخص کو ہدایت
 نہیں کرتا جو حد سے بڑھنے والا اور ریب و
 شک میں مبتلا ہو۔

(المومن)

اس مرد مومن کو اپنے عقیدہ و مسلک کی صداقت پر اتنا بھروسہ ہے
 کہ وہ حیرت انگیز عزم و یقین کے ساتھ قوم کو اپنے مسلک کی دعوت دیتا ہے۔

يَقَوْمِ اتَّبِعُونِ اِهْدِكُمْ

اے میری قوم تم میرے پیچھے چلو۔ میں
 تم کو ہدایت کی راہ دکھاتا ہوں۔

سَبِيلَ الرَّشَادِ -

اور اس قوم کے انجام کے متعلق بھی وہ کس درجہ محکم اور غیر متزلزل

یقین رکھتا ہے۔

تم بہت جلد اس بات کو یاد کرو گے جو
 میں تم سے کہتا ہوں۔ اور میں اپنا معاملہ
 خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ بے شک اللہ تعالیٰ

فَسَتَذْكُرُونَ مَا اَقُولُ لَكُمْ

وَأَفِضُ اَمْرِي اِلَى اللّٰهِ اِنَّ

اللّٰهُ بَصِيْرٌ مِّمَّا لِعِبَادٍ -

بندوں کے حالات کا دیکھنے والا ہے۔

(المومن)

حاصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء جن لوگوں کے ذریعہ انقلاب برپا کرتے ہیں

وہ سب چشمہ نبوت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اور ان کو مقصد سے اس

قدر گہری عقیدت ہوتی ہے کہ اسکے لئے جان و مال اور اولاد کی قربانی انکی

نظر میں ہر بات سے آسان تر ہوتی ہے۔

تمنت سلیمی ان نموت بحبہا

واھون شیء عندنا ما تمنت

تربیت فکر و عمل | اخلاص مقصد اور تقویت یقین کے لئے یہ ضروری ہے کہ افراد جماعت کو کچھ ایسے احکام و فرائض کی

پابندی کا عادی بنایا جائے جن سے ان کا ذوق یقین بڑھے، ان کی عملی صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہو۔ جذبہ منفعت ذات کمزور، اور اجتماعی ملی احساس تیز تر ہوتا جائے۔ طبیعتوں میں ضبط و نظم اور سیرت و کردار میں پاکیزگی پیدا ہوتی جائے

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے خدائے قدوس کی طرف سے کچھ عبادات کی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ نماز روزہ، زکوٰۃ اور حج بظاہر چند مذہبی رسوم ہیں جن کا انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن وقتِ نظر سے دیکھا جائے تو یہ فکر و عمل کی تربیت کے لئے ایک مکمل نصاب ہے۔ اسلام میں دوسرے مذاہب کی طرح عبادت محض رسوم و آداب کا نام نہیں ہے کہ مندر یا گرجے میں پہنچ کر آپ چند مقررہ رسمیں ادا کرنے کے بعد یہ سمجھ لیں کہ بس اب پر ماتا یا خدا ہم سے خوش ہو جائیگا۔ اور اب زندگی کے دوسرے معاملات میں ہماری اپنی مرضی کام کرے گی۔ یعنی اب ہم خدا کی مملکت سے نکل کر انسانی مملکت میں آگئے ہیں۔ اور یہاں خدا کی مرضی کی رعایت رکھنا ضروری نہیں رہا۔

ورہل اسلامی عبادت زندگی کے اجتماعی نظام کا ایک حصہ ہے اور اسکو ایک لمحہ کے لئے بھی زندگی کے معاملات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ قرآن حکیم نے مطلق عبادت اور خاص خاص عبادات کا جہاں

جہاں ذکر کیا ہے، ان کے مصالِح و حکم بھی ساتھ ہی بیان کر دیئے ہیں، جیسا کہ عام عبادت کی نسبت قرآن کریم نے واضح طور پر کہہ دیا ہے۔

مَآ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ
فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ
أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ (زمر)

ہم نے فی الواقع آپ کی طرف کتاب اتاری ہے۔ پس آپ اللہ کی عبادت کریں۔ اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کر کے۔ یاد رکھو کہ دین خالص اللہ ہی کے لئے ہے۔

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ
مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ - (زمر)

اے نبی آپ کہہ دیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں۔ دین کو اس کے لئے خالص کر کے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اسلام میں عبادت، نظام اطاعت کا ایک حصہ ہے۔ اور جماعت مسلمہ کے ہر رکن سے اسلام یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ عبادت اور اطاعت کو ایک ہی ذات کے لئے مخصوص کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ عبادت تو اللہ کے لئے ہو اور زندگی کے دوسرے معاملات میں ہوئے نفس یا غیر الہی قانون کی اطاعت کی جائے۔ یعنی اسلام آپ کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ آپ اپنی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں ایک حصہ تو خدا کے لئے ہو اور دوسرا شیطان کے لئے بلکہ اسلام آپ سے یہ چاہتا ہے کہ آپ کی پوری زندگی خدا کی مرضی کے مطابق بسر ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا
فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا

اے ایمان والو تم داخل ہو جاؤ اسلام میں مکمل طور پر۔ اور شیطان کے نقوش قدم

خَطُواتِ الشَّيْطَانِ - کا اتباع مت کرو۔

ایک دوسری جگہ عبادت کا یہ مقصد بیان کیا گیا ہے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ
الْيَقِينُ - (الحجر) تک کہ آپ کو یقین کا اعلیٰ مقام حاصل ہو جا۔

اسی طرح خاص خاص عبادات کو قرآن حکیم بار بار ذکر کرتا ہے۔ اور ہر مرتبہ ان کی کسی خاص حکمت و مصلحت کو بھی بالوضاحت بیان کرتا ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق ایک جگہ ارشاد ہوا ہے۔

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ
تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ - اور آپ نماز قائم کریں۔ بے شک نماز
بے حیائی اور برائی سے باز رکھتی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کو شخصی اور اجتماعی سیرت کی اصلاح و تعمیر میں خاص دخل ہے۔ اور جو نماز انسان کے اخلاق کو بلند کرنے اور سیرت و کردار کی اصلاح و تعمیر سے قاصر ہے۔ وہ حقیقت میں نماز ہی نہیں ہے۔

تسویہ صفوں کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

لَتَسَوْنَ صَفْوَكُمْ ا و تم اپنی صفیں سیدھی کرو گے ورنہ اللہ تعالیٰ

يُنْخَلِفُ اللّٰهُ بَيْنَ وِجْهِكُمْ (ترندی) تم میں اختلاف پیدا کر دے گا۔

قرآن کریم میں روزہ کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ
عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَيْكُمُ
الذِّكْرُ مِنَ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ - لے اے ایمان! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں
جیسے کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو
تم سے پہلے ہو گئے ہیں تاکہ تم صابِ تقویٰ بن جاؤ۔

”تقویٰ“ کی اصطلاح قرآن حکیم میں ہر جگہ اور ہر موقع پر استعمال ہوئی ہے اور اسکا مفہوم اتنا جامع اور اتنا وسیع ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ اسی سے بلند سیرت اور پاکیزہ اخلاق کی تشکیل ہوتی ہے۔ اسی سے سیاستِ عادلہ اور معیشتِ صالحہ عالم وجود میں آتی ہے۔ اور اسی سے ایک مہذب تر اور صحت مند معاشرہ تیار ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ
وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ
لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ۔ (سورہ احزاب)

اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرو اور
ٹھیک ٹھیک بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال
کو درست کر دے گا۔

بلکہ اگر تقویٰ نظر سے دیکھا جائے تو تقویٰ ہی وہ حقیقی طاقت ہے جو انسان کو شرف انسانی کی بلندیوں پر کھڑا کرتی ہے۔ اسکے اعمال میں اعتدال و توازن قائم رکھتی ہے۔ اور اسکو حقیقی غلبہ و اقتدار عطا کرتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن
تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا
وَيُخْرِجْكُمْ مِّنْ سَيِّئَاتِكُمْ۔
(الانفال)

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے
تو اللہ تمہارے لئے فرقان (حق
اور باطل میں فرق کرنے والی قوت) پیدا
کر دیگا۔ اور تمہاری برائیوں کو تم سے مٹا دیگا۔

زکوٰۃ کی اجتماعی اور ملی حیثیت بالکل ظاہر ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اسکو ایک اجتماعی فریضہ قرار دیا ہے۔ اور مرکزِ ملت کو اختیار دیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے کر حسب حاجت و ضرورت مستحقین میں تقسیم کرے۔ اس سے دو قسم کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ملت کے وہ افراد

جو خود کمانے سے معذور ہیں باعزت طریق سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اور وہ دوسروں پر بوجھ نہیں بنتے۔ اسکے نتیجہ کے طور پر معاشرہ میں امکانی حد تک معاشی مساوات رونما ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ زکوٰۃ دینے والے لوگوں میں جذبہ منفعت ذات فنا ہو جاتا ہے۔ اور اس سے ان کے نفوس کا تزکیہ ہوتا ہے۔

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ
وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ
صَلَاةَ تَاكٍ سَلَتْ لَهُمْ -
آپ ان کے اموال سے صدقہ لیں جو
ان کو پاک کرے گا۔ اور ان کے نفوس کا تزکیہ
کرے گا۔ اور ان کے حق میں دعا کریں، آپ کی دعا
ان کے لئے باعث طہانیت خاطر ہے۔

(التوبہ)

قال رسول الله صلعم توخذ
من اغنياءهم وتورد الى فقرائهم
بالکل یہی حال فریضہ حج کا ہے۔ کعبۃ اللہ مسلمانان عالم کا روحانی اولیٰ
ملی مرکز ہے اور سال میں ایک مرتبہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے سربر آوردہ
افراد کا اجتماع ہمہ گیر جذبہ اخوت اسلامی کی تجدید کرتا ہے۔ اور اس سے پشیمان
شخصی، اجتماعی اور ملی نتائج و ثمرات پیدا ہوتے ہیں۔ خدائے قدوس نے
”قیاماً للناس“ کے الفاظ میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسکے علاوہ
حج کے بارہ میں بھی قرآن حکیم نے ”تقویٰ“ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔
جس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

اللہ کے پاس قربانیوں کے گوشت اور

لَوْ يَتَذَكَّرُ اللَّهُ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ

وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ (حج) خون نہیں پہنچتے بلکہ تمہارا تقویٰ ہی پہنچتا ہے
 حاصل یہ ہے کہ اسلامی عبادت سے مقصود بالذات اگرچہ تعلق باسٹر کو
 تقویت دیتا ہے۔ لیکن یہ تعلق ایسا نہیں ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبے (جو
 دوسری قوموں میں دین کی گرفت سے آزاد ہوتے ہیں) اس تعلق سے بنیاد
 ہوں، بلکہ یہاں پوری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔

مصلحت کلید کی رعایت معاشرہ کی سیاست و معیشت میں سطحی
 انقلاب لانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ محض
 مادی قوت، فوجی حملہ و هجوم، جبر و تشدد، وحشت و بہیمیت، سیاسی
 جوڑ توڑ، پارٹی پارٹی بالٹیکس کے بے مغز دعاوی، اور بعض دفعہ بے مقصد منگامہ
 آرائیوں اور بے حقیقت نعروں سے بھی ایسا انقلاب بپا کیا جاسکتا ہے
 لیکن تعمیری انقلاب جو اسوۂ نبوت کے ذریعہ معرض وجود میں آتا ہے انتہائی
 مشکل اور سخت وقت طلب ہے۔ اس میں سب سے پہلے انسانوں میں
 انقلابی فکر اور اسلامی ذہن پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر بہ تدریج پوری زندگی
 کو بالکل ایک نئے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس راہ میں جو عملی مشکلات
 پیش آتی ہیں ان کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو حقیقی انقلاب اور سطحی
 انقلاب کے فرق کو سمجھنے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتا ہے۔ اور جو اس
 میدانِ کارزار کا مرد شمشیر زن ہے۔ اور جن لوگوں کے یہاں خود ہمیشہ تن پروری
 کی تسکین ہی زندگی کا حقیقی مسئلہ ہے۔ اور ان کا پورا فلسفہ زندگی انہی
 بنیادوں پر اٹھایا گیا ہے۔ وہ انبیاء علیہم السلام کی انقلابی مہم کی

حقیقت کو کیا سمجھ سکتے ہیں ؟

منصور بہ سرور اور اپنی نکتہ خوش سرائید

از فلسفی میر سید امثال این مسائل

اس راہ کی ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ جو عقائد و خیالات لوگوں میں
فلسفہ بعد نسل چلے آتے ہیں ان کی عقیدت و محبت کچھ اس طرح قلوب
اذہان پر مسلط ہوتی ہے کہ وہ ان کے خلاف معمول سے معمولی بات بھی
سننا پسند نہیں کرتے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت قلوب و اذہان
کے تزکیہ و تطہیر ہی سے کام کی ابتدا کرتی ہے۔ اور پھر دوسرے مرحلہ پر
نئے عقائد و خیالات اور علوم و افکار سے اس خلا کو پُر کیا جاتا ہے جسکو
تعمیر فکر کہتے ہیں۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین کا مقصد
محض جزوی انقلاب بپا کرنا نہیں ہوتا، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں مکمل
تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی تبدیلی جس میں زندگی کا نقطہ نظر
ہی بدل جائے اور انسان کا ظاہر و باطن سراسر منقلب ہو جائے، اتنا
محنت طلب اور کٹھن ہے کہ عصر حاضر کا انسان اسکا تصور ہی نہیں کر سکتا
اور توفیق الہی کے سوا اس کام کی تکمیل و شواہد ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔
ان عملی مشکلات کے علاوہ انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی از حد ناگزیر
ہے۔ جو لوگ جماعت کے بنیادی اصول و مقاصد کے اقرار و تسلیم کے بعد جماعت
میں داخل ہوتے ہیں۔ انکی ذہنی، فکری اور عملی صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتیں

کوئی فطرتِ صالحہ رکھتا ہے جو پہلے سے قبولِ حق کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ اور کوئی محض دیکھا دیکھی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور اسکے شعورِ ذہن میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ ایک اعلیٰ درجہ کا ذہین ہے جو جدید فکر کو قبول کرنے کے بعد فوراً اسکے تمام تقاضوں کو سمجھنے لگتا ہے اور وہ سہرا اتنی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا کہ اس انقلابی فکر کو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی کر سکے۔ اسلئے ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جماعت میں آنے کے بعد دینِ خالص اور نظریہ جماعت کی شدید پابندیوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت نہ رکھتے ہوں اور انکی اصلاح و تربیت پر کافی وقت صرف کرنے کی ضرورت ہو۔ مگر انکی کامل تربیت سے پہلے دعوتِ مہم کی راہ میں ان کو اپنے ساتھ چلانا اعلیٰ درجہ کی انتظامی بصیرت، غیر معمولی ذہانت اور ملت کی اجتماعی مصلحتوں کے فہم و ادراک کا متقاضی ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر انقلابی مہم کی کامیابی صرف اسی شکل میں ممکن ہے کہ پہلے جماعت کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کا جائزہ لیا جائے۔ اول حقیقت شناس نگاہ سے اس بات کا یقین حاصل کیا جائے کہ علم و عمل ماحول اور حالاتِ زمانہ کے پیش نظر جماعت کا موقف کیا ہے؟ اور ان مخصوص حالات میں اس سے کتنا کام لیا جاسکتا ہے؟ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا یہی وہ مشکل ترین مقام ہے جس میں دوسرے لوگ بالعموم غلط راہ اختیار کر جاتے ہیں۔ اور جس سے ان کا کیا کرایا کا رت چلا جاتا ہے۔

تیرا اس دعوت کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں فوری نتائج (العاجلہ) کے مقابلہ میں دور رس نتائج یا ملت کی مصلحت کلیہ (العاقبہ) کو بہر حال ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ ایک قانون کلی ہے۔ اور اسوۂ نبوت کی روشنی میں اس سے سیکڑوں جزئیات اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ انکار منکر (برائی) کے خلاف اظہار نفرت، مسلمانوں کا مذہبی اور ملی فریضہ ہے۔ اور اسکی ضرورت اہمیت کا اندازہ ان بے شمار آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے ہو سکتا ہے جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ دعوت اقامت دین کی راہ میں ایسے حالات بھی پیش آ سکتے ہیں کہ یہ فریضہ نہ صرف یہ کہ ساقط ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کا ترک ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علماء و مفکرین نے اس اصل کو جو قرآنی آیات اور اسوۂ نبوت سے ماخوذ ہے۔ باقاعدہ قانونی شکل دیدی ہے۔ علامہ ابن قیم اپنی مشہور و معروف کتاب "اعلام المؤمنین" میں لکھتے ہیں۔

انحضرت صلعم نے برائی کے خلاف اظہار نفرت کرنا امت کے لئے ضروری قرار دیا ہے تاکہ اسکے مٹانے سے معروف حاصل ہو لیکن اگر انکار منکر سے آنکر یعنی اس سے بھی بڑی برائی پیدا ہوتی ہو تو اس کا انکار ہرگز مناسب نہیں ہے۔ اگرچہ اس

ان ولنبی صلی اللہ علیہ وسلم شرع لامتہ انکار المنکر لیحصل بانکارہ من المعروف ما یحبہ اللہ ورسولہ فاذا کان انکار المنکر لیس تلزم ما ہوا نکومنہ والبغض الی اللہ ورسولہ فانه

لا یسوخ انکاره وان کان اللہ
 یبغضہ ویمقت اہلہ و هذا
 کالانکار علی الملوک والولاة
 بالخروج علیہم فانہ اساس کل
 شر و فتنۃ الی اخر الدھر وقد
 استأذن الصحابة رسول اللہ
 صلعم فی قتال الابرار الذین
 یخرجون الصلوة عن وقتہا و
 قالوا "افلا تقاتلہم" فقال "لا
 ما اقاموا الصلوة" وقال من درى
 من امیرہ ما یکرہہ فالہ یصابر
 ولا ینزع یداً عن طاعته۔
 ومن تامل ماجری علی
 الاسلام فی الفتن الصغار
 والکبار راہا من اضاعته
 هذا الاصل وعدم الصبر
 علی المنکر فطلب ازالۃ فتنہ
 منہا هو اکبر منہ۔
 (اعلام الموقعین ج ۲ ص ۱۵۱)

منکر کو اللہ تعالیٰ بڑا سمجھتا ہے۔ اور
 اس منکر کے ارتکاب کرنے والوں کو سزا
 دیتا ہے۔ اسکی مثال جیسے کہ امرار و لوک کے
 خلاف خروج کرنا ہے۔ یہ مسلسل فتنہ و شرکی امثال
 ہے۔ صحابہؓ نے رسول اللہؐ سے اُن امرار کے
 خلاف جنگ کرنے کی اجازت طلب کی جو نماز
 کو وقت سے موخر کر دیتے ہیں۔ اور کہا کہ "کیا
 ہم ان سے قتال نہ کریں؟" آپ نے جواب دیا۔
 "ہرگز نہیں" جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں
 اور فرمایا جو شخص اپنے امیر سے کوئی ایسی بات
 دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہے تو اسے صبر
 کرنا چاہئے۔ اور اطاعت کا تمہ نہیں چھیننا چاہئے۔
 اسلام پر جتنے چھوٹے بڑے فتنے نازل
 ہوئے ہیں ان پر اگر دقت نظر سے غور کیا
 جائے تو یہ بات خود بخود ہی نظر آجائے گی کہ یہ
 سب کچھ اس اصل کے نتائج کرنے اور اسکی
 رعایت نہ کرنے کی وجہ سے ہوا۔ یعنی منکر پر
 صبر کرنے کی بجائے اس کے ازالہ کی کوشش کی گئی اور
 نتیجہ کے طور پر اس سے بڑی بڑی پیدا ہوتی چلی گئی۔

علامہ موصوف نے اسی کتاب میں انکار منکر کی چار صورتیں بیان کی ہیں۔ (۱) منکر کے مٹنے کے بعد اسکی ضد (معروف) پیدا ہو۔ (۲) منکر اگرچہ بالکل بے نہ مٹ سکے لیکن پہلے سے کم ہو جائے (۳) اپنی طرح کی دوسری برائی اپنے پیچھے چھوڑ جائے۔ (۴) اسکے مٹنے کے بعد اس سے بڑی اور خطرناک برائی پیدا ہو جائے۔ پہلی دو صورتیں مشروع اور ضروری العمل ہیں تیسری صورت مجتہد فیہ ہے۔ اور چوتھی حرام اور واجب ترک ہے۔ مثلاً اہل معصیت کو تم دیکھتے ہو کہ وہ شطرنج کھیل رہے ہیں۔ یہ کام یقیناً المنکر میں داخل ہے۔ اور اگر تم جانتے ہو کہ تمہارا بے انکار سے یہ لوگ شطرنج سے ہٹ کر کسی مفید اور نیک کام میں لگا جائینگے تو اس صورت میں ایسا کرنا ضروری ہے۔ لیکن آپ قرآن و آثار سے یہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ شطرنج کو چھوڑ کر ایذا رسانی، غصب اموال اور اس قسم کے شنیع اعمال کا ارتکاب کریں گے تو مصلحت کا اقتضا یہ ہے کہ ان کو اسی حال میں رہنے دیا جائے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ تم تاروں کے زمانہ میں کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو شراب پی رہے تھے۔ میرے ساتھیوں نے ان پر انکار کیا میں نے ان ساتھیوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب سے اسلئے منع کیا ہے کہ وہ اللہ کے ذکر اور نماز سے باز رکھتی ہے۔ مگر ان لوگوں کو قتل نفوس غصب اموال اور مخلوق خدا کو قیدی بنانے سے روکتی ہے۔ اسلئے بہتر یہ ہے کہ ان کو اسی حال میں رہنے دیا جائے۔

حاصل یہ ہے کہ عقل و شرع کے نزدیک ہمیشہ سے یہ حقیقتیں مسلم چلی آتی ہیں کہ دو برائیوں میں سے کمتر برائی (اھون البلیتین) کو اختیار کر لیا جائے۔ کسی بہت بڑے مقصد کے حصول کے لئے کچھ نقصان برداشت کیا جاسکتا ہے۔ شخصی اور گروہی مفادات کو دینی اور ملی مفاد کے لئے قربان کر دینا چاہئے کہ اس سے پائدار اور مستقل نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ عام چلتی اور دینی مقاصد کے لئے کچھ لوگوں سے نرمی اور رعایت کا سلوک کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ مصلحت کلیہ کی خاطر بعض دفعہ کچھ فرائض بھی نظر انداز کئے جاسکتے ہیں۔

مگر اس مقام پر اس بات کو ہرگز بھولنا نہیں چاہئے کہ ایسے حالات کی تعیین و تشخیص کے لئے اعلیٰ درجہ کی دینی بصیرت، بے نظیر فہم و ذکاوت اور غیر معمولی ذہانت و فرزانگی کی ضرورت ہے۔ ہر شخص کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ حالات کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لے کر صحیح اور مناسب فیصلہ کرے۔ یا احکام و فرائض کی حقیقی قدروں کو سمجھ کر ہر چیز کو اسکی مناسب جگہ پر رکھے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص کو اسکی اجازت دیدی جائے تو اسلام کا نظام اجتماعی درہم برہم ہو جائے۔ اور اسلامی قانون اخلاق کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہے۔

بہر حال اسوۂ نبوت کی روشنی میں ایک مستقل فلسفہ دعوت مرتب کیا جاسکتا ہے۔ جس سے ہم دعوت اقامت دین میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر اسکے لئے کتاب اللہ اور منہاج نبوت کا عمیق مطالعہ کرنا چاہئے۔

ہم اسکے کچھ نظائر ذیل میں درج کرتے ہیں۔

عہد نبوت میں غزوہ اُحد اور غزوہ حنین میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد میدان جنگ سے بھاگ نکلی تھی۔ یہ ایک اخلاقی مذہبی اور ملی گناہ ہے۔ قرآن حکیم نے ایسے اشخاص کے لئے ”بَاغٍ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ“ کے پر مہیت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ نیز یہ ایک جماعتی جرم تھا۔ اور امیر ملت کو یہ حق پہنچتا تھا کہ ان لوگوں کو شدید سزا دے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کو معاف کر دیا۔ اور خداوند تعالیٰ نے آپ کے اس طرز عمل کی تعریف فرمائی۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ
 لَئِن لَّمْ يَكُنِ لَّكَ
 اِنْتِ لَهْمُ وَاوَكُنْتَ زُنًا غَلِيظًا
 اَلْقَلْبِ لَا اَنْفَضُوْا مِنْ حَوْلِكَ
 آپ نے اللہ کی رحمت سے ان لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا۔ اگر آپ سخت ہو جاتے اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ سے دور

(آل عمران) بھاگ جاتے۔

مجاز جنگ پر حدود اللہ کے عام نفاذ کی مصلحت بھی یہی ہے کہ وہاں ایک بہت بڑا مقصد نگاہ کے سامنے ہوتا ہے۔ اور اسکی خاطر بہت سے امور کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔

ان البنی صلی اللہ علیہ وسلم
 انہی ان تقطع الایدی فی العزو۔
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے موقع پر ہاتھ کاٹنے سے منع فرمایا ہے۔ (رداہ ابوداؤد)

ظاہر ہے کہ اس موقع پر جن ہاتھوں سے کفر و معصیت اور فتنہ و فساد کے مٹانے کا کام لیا جا سکتا ہے انکو چوری کی سزائیں کاٹ دینا

کسی طرح قرین مصلحت نہیں ہے۔

مصلحت عامہ کو ملحوظ رکھنے کی ایک مثال یہ ہے کہ جو لوگ نئے نئے جماعت میں شامل ہوں، اور وہ فکر و عمل کے اعتبار سے ابھی ناچختہ ہوں ان پر اگر دفعۃً تمام دینی احکام و قرآن فیض اور شدید جماعتی ڈسپلن کا بار گراں ڈال دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اسکی تاب نہ لاسکیں اور وہیں سے برگشتہ خاطر ہو جائیں۔ اس معاملہ میں اسوۂ نبوت یہ ہے کہ ان لوگوں کو تدریجی طور پر ان پابندیوں کا خوگر بنایا جائے۔ اعمول حکمت کے تحت انکی صحیح تربیت کی جائے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ خود بخود ہی تمام دینی پابندیوں کو بخوشی قبول کر لیں۔

اسی طرح بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک کام کے فوری نتائج نہایت دل فریب اور پرکشش ہوتے ہیں۔ لیکن ان فوری نتائج کے مقابلہ میں پرہیز اور شاندار نتائج و ثمرات کی توقع ہوتی ہے۔ اور ان کی خاطر فوری اولیٰ عارضی نتائج کو پس انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسکی مثال یوں سمجھئے کہ ایک نیا ملک فوجی طاقت سے فتح کیا جاتا ہے اور اس ملک کے جملہ وسائل پیداوار فائزین کے زیر اقتدار آجاتے ہیں۔ اس موقع پر العاجلہ کا اقتضا یہ ہے کہ ان وسائل پیداوار سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا جائے۔ اس ملک کے باشندوں کے قومی اور ملی تقاضوں سے بے اعتنائی کی جائے اور کامل تسلط کے بعد ان پر گراں بار ٹھیکس عائد کئے جائیں۔ اور لوٹ گھسوٹ سے اپنے لئے غش و نشاط کا سامان مہیا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طریق کار سے کچھ دیر

کے لئے فائدہ ہی فائدہ ہوگا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکے گا اور ملت کی مستقبل عامہ کا اقتضایہ ہے کہ مفتوحین کو ہر طرح کی آزادی عمل اور حریتِ فکر عطا کی جائے۔ ان کے وسائل پیداوار کو انہیں کے قبضہ میں رہنے دیا جائے۔ ان کے اجتماعی اور مذہبی احساسات کا احترام کیا جائے۔ اور ان کو جدید حکومت کے تحت ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں، تاکہ ان کو یقین ہو جائے کہ ہمارے انفس و اموال ہماری تہذیب اور کلچر، ہماہمی مذہبی روایات اسی حکومت کے زیر اثر محفوظ رہ سکتی ہیں۔ اس فراخ دلانہ طرز عمل سے سیاسی طور پر یہ فائدہ ہوگا کہ یہ لوگ ہمیشہ کے لئے اس حکومت کے وفادار رہیں گے۔ اور دینی لحاظ سے یہ فائدہ ہوگا کہ مسلمانوں کے ساتھ میل جول اور انکی اجتماعی اور شخصی سیرت کے مشاہدہ و تجربہ سے وہ لوگ بہ تدریج دینی اثر قبول کرتے جائینگے۔

تیز اقامتِ دین کی جدوجہد میں حصہ لینے والوں کے لئے زمانہ کے مخصوص حالات، ماحول اور ممالک کے برسرِ اقتدار طبقہ اور عوام کے نفسیات اور ذہنی صلاحیتوں کا عمیق مطالعہ بھی از حد ناگزیر ہے کیونکہ یہ لوگ دعوتِ حق کے براہِ راست مخاطب ہیں۔ اور داعیِ حق جماعت کی معمولی سی لغزش مقصد کو شدید نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اگر ملک کی زمامِ اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہو تو اس وقت دعوت کے طرز و طریق کیا ہوں۔ اور اگر مسندِ اقتدار پر خود مسلمانوں کا غلط کار

اور معصیت کو شطبہ قابض ہو تو اس حالت میں دعوتِ اقامتِ دین کا رنگ کیا ہو؟ یہ تمام مسائل ایسے ہیں جو پیغمبرانہ دعوتِ انقلاب کے اہم اور ناقابل فراموش پہلو ہیں۔ اور ان کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے

السمع والطاعة یوں تو ہر قومی اور اجتماعی تنظیم میں سمع و طاعت کی اہمیت و ضرورت کا احساس پایا جاتا ہے اور

اسکے سوا کوئی انسانی جماعت اپنے اجتماعی مقاصد میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی جماعت میں سمع و طاعت کو ایک مقدس مذہبی اور اخلاقی فریضہ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں سمع و طاعت جماعت کی ملی سیرت کا ایک مستقل باب ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو خالص مذہبی فریضہ قرار دیا ہے۔

قال رسول الله صلعم وانا

فرمایا کہ میں تم کو پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے۔

امر کمر بخمس الله امرني بهن

الجماعة والسمع والطاعة

والهجرة والجهاد في سبيل الله

فانه من خرج من الجماعة

قيد شبر فقد خلع رابطة الاسلام

عن عنقه الا ان يراجع -

(رواه احمد)

قال عبادة بن الصامت

في

لتزام جماعت، سمع و طاعت، ہجرت

اور جہاد فی سبیل اللہ۔ کیونکہ جو شخص

ایک بالشت بھی جماعت سے نکل گیا گویا

اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے اتار

لی لی۔ مگر اس صورت میں جبکہ وہ پھر

جماعت میں آجائے۔

عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے

دعانا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم
فبايعنا فقال فيما اخذ علينا
ان بايعنا على السمع والطاعة في
منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا
واثره علينا وان لا ننازع الامر
اهله الا ان تزواكفرا بواحا عندك
من الله فيه برهان -

(بخاری کتاب الفتن)

نے ہم کو بلایا اور ہم سے بیعت لی۔ ہم سے
جو عہد لیا وہ یہ ہے کہ ہم ہر حال میں سنے
و طاعت کے پابند رہیں۔ خواہ آرام و
خوشی کا وقت ہو یا بےخوشی و مصیبت کا یا
ہم سے ترجیحی سلوک کیا جا رہا ہو۔ نیز اس
بات کا ہم نے عہد کیا کہ حکومت کے معاملہ
میں اہل حکومت سے نزاع نہ کریں گے۔
ہاں اگر حکومت ایسا کر سکتے ہو جبکہ تم نہیں
ایسا واضح کفر دیکھ لو جسکے لئے تمہارا پاس
خدا فی سند موجود ہو۔

اصل میں دین (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ہے ہی ایک مکمل نظامِ اطاعت
لیکن یہ اطاعت عملی طور پر دو طریقوں سے تشکیل ہوتی ہے۔ ایک بلا واسطہ اور
دوسری بالواسطہ۔ نبی اور امیر کی اطاعت دوسری قسم میں شامل ہے۔
قرآن حکیم نے اطاعت کی یہ دونوں قسمیں بیان کی ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا
اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي
الْأَمْرِ مِنْكُمْ - (النساء)

اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو
اور رسول کی۔ اور تم میں سے جو امیروں
انکی اطاعت کرو۔

اس موقع پر قابل لحاظ بات یہ ہے کہ الی الرسول کی اطاعت کو فعل
کے تکرار سے اور اولی الامر کی اطاعت کو بلا تکرار فعل ذکر کیا گیا ہے جس سے

ہم باسانی یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ رسول کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت میں قدر مشترک ایک ہی ہے کہ یہ دونوں اطاعتیں مقصود بالذات نہیں ہیں مقصود بالذات صرف اول الذکر اطاعت راطیع اللہ ہی ہے۔ اور یہ دو اطاعتیں بالترتیب درمیانی واسطہ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ رسول کو امارت و امامت کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس حیثیت سے بھی اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ رسول کی امامت و امارت براہ راست خدا سے حاصل ہوتی ہے اور رسول کے احکام میں غلطی کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا اسلئے کہ وہ معصوم اور مہم من اللہ ہوتے ہیں۔ اور دوسرے امراء و خلفاء رسول ہی کی عملی سیرت کی اقتدا کرنے کی وجہ سے اطاعت کے اہل تصور کئے جاسکتے ہیں۔ اسوجہ سے اطاعت رسول اور اطاعت اولی الامر میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کی طرح مقصود بالذات مان لیا جائے کہ یہ اسلام کی نظر میں شرک ہے۔

وَمَا كَانَ لِلنَّبِيِّ أَنْ يُوَدِّيَنِي
اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالنَّبُوَّةَ
ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا
لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا
رَبَّابِينَ بَيْنَ يَدَيْكُمْ تَعْلَمُونَ
الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تُرْسُونَ

نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکو کتاب، حکومت اور نبوت عطا کرے۔ اور پھر وہ لوگوں سے یوں کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (بلکہ وہ تو یوں کہتے ہیں) کہ تم اللہ والے بن جاؤ، اسلئے کہ تم کتاب اللہ کو پڑھاتے اور پڑھتے ہو۔

بلکہ رسول کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی اطاعت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور خود بھی اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِّ أُمَّةٍ
مِّنَ الْأُمَمِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ
أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ -

پھر ہم نے آپ کو دین کی ایک شریعت پر مبعوث کیا۔ پس آپ اس شریعت کی پیروی کریں۔ اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کریں جو کچھ بھی سمجھ نہیں رکھتے۔

اور جہاں نبی یہ کہتا ہے کہ میری اطاعت کرو، اطیعون، تو اسکا مطلب صرف اتنا ہے کہ میں رسول کی حیثیت سے تم سے جو مطالبہ کرتا ہوں اسکو تسلیم کر لو اور جس طرف میں تم کو لے جانا چاہتا ہوں تم میرے پیچھے اس طرف کوچل پڑو۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ دوسری قومیں چونکہ زندگی کا کوئی پاکیزہ نصب العین نہیں رکھتیں۔ اور نہ ہی خیر و شر اور نیک و بد کے امتیاز کے لئے ان کے پاس کوئی اخلاقی دستور العمل ہے۔ اسلئے ان کے یہاں اطاعت کا مفہوم ہی متعین نہیں ہے۔ اور نہ ہی اسکی حدیں مقرر ہیں مگر انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی سیرت و اخلاق کی اصلاح کریں۔ اور انسانی جماعت کو دائم اخلاق سے بچا کر منزل مقصود کی طرف لے جائیں اسلئے وہ ایک متعین اور مرتب نظام اطاعت اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اور اس نظام کے تحت اپنے پیروں سے سمع و طاعت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اسلام میں یہ بات مانی ہوئی ہے کہ معصیت کے

کاموں میں کسی کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ اور پھر اسلام نے خیر و شر کی اخلاقی قدریں بھی متعین کر دی ہیں۔

عن النبی صلعم قال لسمع

والطاعة علی المرء المسلم فیما

احب وکراه ما لم یؤمر بمعصیة

فاذا امر بمعصیة فلا سمع

دلاطاعة۔

(بخاری) نہ ماننا (طاعت) جائز ہے۔

جو قومیں علوم نبوت سے بے بہرہ ہوتی ہیں، ان میں حیات انسانی کے مختلف

شعبہ ہا زندگی کی تنظیم و ترتیب

اجزاء کی تنظیم اور شعبہ ہائے زندگی کے توازن کو برقرار رکھنے کی خواہش

بالکل منفقور ہوتی ہے۔ زمانہ کی ٹھوکر جس جانب کو ان کا رخ پھیرے وہ اٹھی

طرفت کو پھر جاتی ہیں۔ خواہ دوسری طرفت زندگی کی حسین تمنائیں پامال ہو

ہوں۔ چنانچہ آج اقوام حاشرہ کا رجحان فکر ہمارے سامنے ہے۔ زندگی کی

بے شمار خواہشیں ہیں۔ جو ان کی طرفت حسرت و یاس کی نگاہ سے دیکھ رہی

ہیں۔ مگر یہ قومیں ہیں کہ مسئلہ معیشت کے سوا ان کو کسی دوسری چیز سے

سرور کار ہی نہیں ہے۔ یہ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ زندگی کا حقیقی

مسئلہ فقط معیشت ہی کا مسئلہ ہے۔ اور جس دن یہ حل ہو جائیگا زندگی

کے تمام دوسرے مسائل خود بخود ہی حل ہو جائیں گے۔ مگر یہ اتنی بڑی فضیلت

ہے کہ اس سے بڑی ضلالت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔

در اصل یہ ضلالت کج کی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اہم سابقہ جن کا قرآن حکیم نے بار بار ذکر کیا ہے، اسی گمراہی میں مبتلا رہی ہیں۔ اور ان کی ہلاکت و بربادی کا حقیقی سبب ہی یہ گمراہی تھی کہ وسائل معیشت کی طلب و جستجو اور اسباب زمین و تخیل کی ہوس نے ان کو راہ اعتدال سے پھیر دیا تھا۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرَابَةٍ
بَطَرَتْ مَعِيشتَهَا فِتْنَةً
مَسَاكِينُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ
إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ

کتنی قوموں کو ہم نے ہلاک کیا، جو اپنی
معیشت میں حد اعتدال سے بڑھ گئی
تھیں۔ پس یہ ہیں انکے مکانات جو انکے
بعد بہت ہی کم آباد ہوئے ہیں۔ اور یہی
وارث تو ہم ہی ہیں۔

(القصص)

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اجزا و حیات کی بد نظمی اور بے ترتیبی ہی کا دوسرا
نام فساد اور ظلم ہے۔ اور اس کا طبعی نتیجہ ہلاکت و بربادی کی صورت
میں متشکل ہوتا ہے۔

اور ایسی ہی ہے تیرے رب کی پکڑ جبکہ
وہ قوموں کو انکے ظلم کی وجہ سے پکڑتا ہے،
بے شک تیرے رب کی گرفت بڑی سخت ہے۔
آپ کے رب کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ
ظلم سے بستیوں کو برباد کرے حالانکہ ان
بستیوں کے رہنے والے صلح طلب گے ہوں۔

وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا
أَخَذَ الْقُرْيَةَ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ
أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ - (ہود)
وَمَا كَانَ رَبُّكَ يُهْلِكَ الْقُرْيَةَ
بِظُلْمٍ وَأَهْلِهَا مُصْلِحُونَ -

(ہود)

اسکے برعکس انبیاء علیہم السلام پہلی ہی نظر میں معاشرہ انسانی کے تمام داخلی اور خارجی شعبوں پر منجسستانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ اور پھرا سکی علمی، تہذیبی، معاشی، معاشرتی اور عمرانی خرابیوں کی اصلاح کی جدوجہد کرتے ہیں۔ جہاں ان کو بد نظمی اور بے ترتیبی نظر آتی ہے اسکو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر سب سے پہلے وہ فکر و ذہن کی کج ادویوں سے تعرض کرتے ہیں۔ غلط عقائد و خیالات اور شکوک و شبہات کے کٹاؤں سے قلوب و اذہان کی زمین کو پاک کر کے ان میں صحیح علوم و افکار کی آبیاری کرتے ہیں۔ اور اسکے بعد اسکے خارجی مظاہر تمدن میں جہاں جہاں ان کو مفاہم نظر آتے ہیں، ان کو چن چن کر سامنے لاتے ہیں۔ مثلاً حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں ایک نہایت ہی اخلاق سوز اور خلاف فطرت فعل کا عام رواج تھا۔ اور حضرت لوط علیہ السلام ان کو اخلاص عبادت، توحید اور طاعت اللہ کی دعوت کے بعد بار بار اس عمل سے اجتناب کی تلقین کرتے ہیں۔ اور ان کو یہ باور کراتے ہیں کہ یہ فعل فطرت اللہ کے خلاف ہے۔ اور تم نے پہلی دفعہ اس کو دنیا میں رواج دیا ہے۔

جب حضرت لوط نے اپنی قوم سے کہا کیا تم اس شرمناک فعل کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی شہوانی خواہش پوری کرتے ہو، حقیقت میں تم حد سے بڑھنے والی قوم ہو۔

إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ
الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ
أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ - إِنَّكُمْ
لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ
دُونِ النِّسَاءِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ
(اعراف)

مگر جس قوم میں اس قسم کی اخلاقی بیماریاں جڑ پکڑ چکی ہوں، اور اسکے مزاج میں خبث و ناپاکی بچہ و راسخ ہو چکی ہو، وہ اس طرح کی طہارت و پاکیزگی کو کب پسند کرتی ہے؟ چنانچہ یہی قوم حضرت لوط کے جواب میں یوں کہتی ہے۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا
 أَن قَالُوا أَتَرْجُوهُمْ مِنَ قُرْبَتِكُمْ
 إِنَّهُمْ أَنَاسٌ يَّتَطَهَّرُونَ
 انکی قوم کا یہ ایک ہی جواب تھا کہ ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ کیونکہ یہ لوگ طہارت و پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں۔
 ”انہم اناس يتطهرون“ کے الفاظ قابل غور ہیں۔ یعنی اس قوم کے نزدیک حضرت لوط علیہ السلام کا گناہ یہی ہے کہ وہ طہارت و پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں۔ اور یہی وہ جرم ہے جسکی وجہ سے ان کو سجلا وطنی کی دھمکی دی جا رہی ہے۔

حضرت شعیبؑ کی قوم میں دوسرے مفاسد اجتماعیہ بھی موجود تھے۔ مگر اسکے طرز تمدن و معیشت میں ایک نمایاں خرابی یہ تھی کہ وہ ناپ اور تول میں کمی بیشی کرتے تھے۔ اور شعیب علیہ السلام جہاں ان کو اصلاح فکر کی دعوت دیتے ہیں، وہاں تمدن کے اس ابھرے ہوئے ناسور کی بار بار نشان دہی کرتے ہیں۔

یا لکل یہی حال تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے کہ وہ اپنے مخصوص سلب

۱۴۴ آج ہمارے معاشرہ کی حالت بھی قریب قریب یہی ہے جہاں کے بااقتدار لوگوں اور اہل ثروت کی ذہلیں وہ لوگ گردن زدنی ہیں جو ان کی فحش کاریوں بددیانتیوں اور تم کاریوں کی مدد کرتے ہیں۔

دعوت سے اولاً معاشرہ کے بنیادی اور نمایاں مفاسد کی اصلاح پر زور دیتے ہیں۔ اور جو لوگ ان کے فلسفہ زندگی کے اصول و مبادی کو تسلیم کر کے جماعت میں داخل ہو جاتے ہیں، ان کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ اصلاح و عروج کا نوگر بنایا جاتا ہے۔ ان کے فکر و عمل کے انشیب و فرائز کو حکیمانہ انداز میں متوازن اور ہموار کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح اس انقلابی جماعت کی زندگی صحیح طور پر منظم اور معتدل بن جاتی ہے۔ قرآن حکیم نے انبیاء علیہم السلام کے الہامی دستور اصلاح و تعمیر کو "المیزان" کی اصطلاح سے موسوم کیا ہے۔

در اصل حیات انسانی کے متفاوت اجزا میں ربط و ترتیب قانون فطرت ہی کے ذریعہ پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ قانون فطرت دو حصوں میں منقسم ہے ایک حصہ ہے جس کا تعلق پوری کائنات سے ہے۔ یعنی کائنات کا نظم و نسق اسی کے ذریعہ قائم ہے۔ اس عالمی اور کائناتی قانون میں دو بدل کرنا انسانی حیطہ اختیار سے باہر ہے۔ قرآن حکیم نے اس غیر متبدل اور غیر اختیاری قانون کو کبھی "المیزان" سے تعبیر کیا ہے۔

السَّمَاءُ رَافِعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ
أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ

دوسرا حصہ اختیاری ہے۔ اس میں دو بدل کرنے یا اسکی خلاف بندی

۱۴۵ اس آیت میں المیزان کا اطلاق عام معنی میں کیا ہوا ہے جو دونوں کو شامل ہے۔ لہذا بعد کے فقرہ "وَأَقِيمُوا الْوِزْنَ بِالْقِسْطِ" کے معنی متعین کرنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔

کرتے پر انسان قدرت رکھتا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جس کے توسط سے حضرات
وہابیہ علیہم السلام غیر متوازن معاشرہ انسانی میں توازن قائم کرتے ہیں۔
اور قرآن کریم اسکو "المیزان" کا نام دیتا ہے۔

لَقَدْ آرَسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ
وَآتَيْنَاهُمْ مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ
لِيُقِيمُوا النَّاسَ بِالْقِسْطِ -
ہم نے اپنے رسولوں آیات بینات کے
ساتھ بھیجے۔ اور ان کے ہمراہ کتاب اور
میزان اتاری تاکہ لوگ نقطہ عدل پر کھڑے
ہو جائیں۔ (المحذی)

اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ
بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ - (الشوری)
اللہ وہ ذات ہے جس نے کتاب اور
میزان اتاری۔

ہستی نظام سیاہ و اجماع کی عملی تشکیل
انسانی سوسائٹی میں کامل اول
جامع انقلاب بنا کرنے میں

بہت سے مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً نظیر و تعمیر فکر، تربیت فکر و عمل
اور جماعت کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کی تنقیح و ترتیب، جماعتی تنظیم کی
وہ سرگھن اور دشوار گزار منزلیں ہیں جنکو عبور کئے بغیر منزل مقصود کی
ایک جھلک بھی میسر نہیں آسکتی۔ اور اس دشتِ بلا کی راہ نوردی ہمیشہ
ان لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو مرد و خود آگاہ و حق شناس اور درو عشق
سے آشنا ہوتے ہیں۔ جنکی نگاہ انقلاب آفرین سے دلوں کی دنیا ہی پلٹ
جاتی ہے جنکی صحبت ہر خام کو پختہ تر بنا دیتی ہے۔ اور جنکی قوت کو دارنما
کے دھارے کوئی سمت کی طرف پھیر دیتی ہے۔

پختہ ساز و صحبتش ہر خام را تازہ خونخائے دہد ایام را
 صحبت اور ہر حرف را در کند حکمت اور ہر تہی را پر کند
 جب انسانیت اہل زمانہ کی ستم آرائیوں اور ہوس پرستیوں سے
 جلا اٹھتی ہے۔ حق و عداقت، اور شرافت و دیانت کو کسی گوشہ زمین میں
 پناہ نہیں ملتی۔ خدا کے بندوں کے لئے کائنات کی وسعتیں تنگ ہو جاتی ہیں
 اور ان کے لئے دنیا میں کوئی مہارا باقی نہیں رہتا۔ ایسے وقت میں
 کوئی مرد خود آگاہ اٹھتا ہے، جو زندگی کو نئے ولولوں اور نئی اُمنگوں
 سے ہمکنار کرتا ہے۔

ساہا در کعبہ و بت خانہ می نالہ حیات
 تازہ بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حضرات انبیاء علیہم السلام اور اصحاب دعوتِ تجدید دین کی تاریخ
 کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسانوں کے اذہان و افکار میں نئی تبدیلی
 پیدا کرنا نہایت مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ اس میں ہمیشہ حوصلہ شکن
 خطرات و مہالک اور سبب آزمائش و مصائب و شدائد سے دوچار ہونا پڑتا ہے
 مگر جو لوگ دُھن کے پکے اور صدق و اخلاص کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے
 ہیں، وہ ان روح فرسا اور جگر خراش حالات میں بھی زندگی کے آخری لمحہ
 تک ثابت قدم رہتے ہیں۔ اور ان کا ہر قدم آگے کی طرف ہی بڑھتا چلا جاتا
 ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ معاشرہ کی حیات اجتماعیہ میں مکمل نساج انقلاب بپا
 کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی مشابہ روز کی

اتھک محنت اور سفرِ پشیمانہ جدوجہد یونہی۔ انگاں چلی جائے اور اس کے
عالم انسانی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔

قرآن حکیم نے جن انبیاء و رسول کے حالات بیان کئے ہیں، ان میں
ایک بہت بڑی تعداد ایسے انبیا کی ہے جو آخر دم تک اصلاح و تعمیر اور
تنظیم جماعت کی مہم میں منہمک رہے۔ طعنے سُننے۔ گالیاں کھائیں،
اذیتیں اُکھائیں اور اس راہ میں اتنے شداؤد و آلام برداشت کئے کہ
ان کے تصور ہی سے سینہ شق ہونے لگتا ہے۔

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں

ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

مگر اس شبانہ روز کی محنت و کاوش کے باوجود قوم کے صرف چند
افراد نے ان کی دعوت کو قبول کیا۔ اور پوری قوم ضد اور انکار برپا رہی
رہی۔ مگر کیا یہ مانا جاسکتا ہے کہ ان کی حدیث حق صرف چند کانوں تک
پہنچ کر فنا ہو گئی۔ اور اپنے پیچھے کوئی مستقل اور پائدار اثر نہیں چھوڑ
گئی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ ان انبیاء نے اپنے اپنے زمانہ میں جیسا اور
جتنا کام کیا اس وقت کے لحاظ سے ایسا اور اتنا ہی کام ہو سکتا تھا۔
اور ہر نبی کی جدوجہد انسانیت مطلقہ کے لئے مستقل اور کارآمد ورثہ
چھوڑ گئی ہے۔ مگر تاریخ کے ان ادوار میں انسان کا شعور ذات چونکہ
بالکل ناتمام اور نا پختہ تھا۔ اسلئے انسانی حیات اجتماعیہ میں کامل انقلاب
روزمانہ ہو سکا۔ اور نہ ہی دینی نظام سیاست و اجتماع کی عملی تشکیل

ہو سکی۔ ہاں انبیاء، نبی اسرائیل نے دعوتِ جہاد و اقامتِ دین کے ذریعہ دنیا کے ایک حصہ میں خلافتِ الہیہ قائم کی۔ لیکن انسانیت کا یہ دور بھی حرکتِ ارتقا کے لحاظ سے اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا تھا کہ ایک جا رہے اور مکمل نظامِ حیات ان کے حوالے کیا جاتا جو آنے والی انسانی نسلوں کے لئے درخشندہ مثال بنتا۔

در اصل قدرت کا منشا یہ تھا کہ یہ کام دنیا کی سب سے بڑی شخصیت اور سب سے آخری رہنمائے انسانیت کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہو۔ چنانچہ جناب ختم المرئیت و الرسالۃ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے اس مکمل اور ہمہ گیر نظامِ اجتماع و سیاست کی تکمیل ہوئی۔ آپ نے اپنی زندگی میں اسکو عملاً نافذ کیا۔ اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے اس کو بالکل منہاج نبوت پر جلا یا۔ یہ مقدس نظامِ حیات اگرچہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ لیکن اس مختصر سی مدت میں اس کی عطر پیڑیوں سے کائنات کا ذرہ ذرہ مہرک اٹھا اور عالم انسانی کی دیرینہ تمنائیں پیکر امن و راحت بن کر مشہود و مشکل میں جاوہر ہوئیں۔ اور آج بھی بلا خوف تردید اس بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انسانیت کا یہی وہ دور رحمت ہے، جو نسل انسانی کے لئے ایک معیاری ریفرنڈیل (حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی وہ درخشندہ مثال ہے جس کو سامنے رکھ کر عصر حاضر کا انسان اپنا سفرِ حیات جاری رکھ سکتا ہے۔

ان هو الا ذكرو للعالمين - ولتعلمن نياہ بعد حین
 اس موقع پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ نظام اسلامی اگر
 فی الواقع نسل انسانی کے لئے سراپا رحمت تھا تو زیادہ دیر تک
 کیوں نہ قائم رہ سکا۔ مگر یہاں اس مسئلہ سے متعلق تفصیلی بحث
 میں پڑنے کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ مختصراً اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ
 کسی نظام زندگی کے حسن و قبح کی پہچان کیسے ہو سکتی ہے۔ اور کس معیار
 پر اسکو پرکھا جا سکتا ہے؟

در اصل کسی نظام زندگی کا حسن معلوم کرنے میں جن امور کی ضرورت
 ہوتی ہے وہ یہ ہیں۔ کہ

(۱) اس نظام کے طبعی تقاضے کیا ہیں؟ کیا اس کے ذریعہ ایک
 پرامن، خوش حال اور متوازن معاشرہ انسانی کی تشکیل ہو سکتی
 ہے؟

(۲) تیریہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کیا عملی زندگی میں اسکا نفاذ
 واجراء ممکن ہے؟

(۳) اگر کسی خطہ ارضی میں اس کا نفاذ ہوا ہے تو اس سے عالم
 انسانی کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟

یہ ہیں وہ سوالات جو کسی نظام حیات کے حسن و افادہ کی
 نسبت اٹھائے جا سکتے ہیں۔ اور ان سوالات کی روشنی میں اگر آپ
 اسلامی نظام اجتماع کا جائزہ لیں گے تو یقیناً آپ اس نتیجہ پر

پہنچیں گے کہ

(۲) نظام اسلامی کی طبیعت اور فطرت ایک پاکیزہ پُر امن، اور متوازن معاشرہ انسانی کی مقتضی ہے۔

(ب) اور چونکہ یہ نظام ایک عرصہ تک عملاً نافذ رہ چکا ہے اسلئے اسکے متعلق یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ یہ افلاطون کی "تصوری ریاست" کی طرح ناقابلِ عمل ہے۔

(ج) اور جہاں تک زمانہ رسالت اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے ثمرات و نتائج کا تعلق ہے۔ اسلام کا کوئی بدترین دشمن بھی اس بات کا منکر نہیں ہے کہ تاریخ انسانی کا یہ دور سب سے زیادہ پُر امن اور سب سے زیادہ خوشحال تھا۔

رہا یہ سوال کہ انسان کی ہوسناکیوں نے اس مقدس نظام کو دیر تک کیوں نہ چلنے دیا؟ تو یہ سوال کسی نظامِ زندگی کے حسنِ ذاتی اور حقیقی اعادہ کے سلسلہ میں ہرگز نہیں اٹھایا جاسکتا، بلکہ درحقیقت یہ بالکل الگ سوال ہے۔ جو انسان کے ذہنی اور نفسیاتی عوامل سے متعلق ہے۔

بہ ہر حال یہ مکمل اور صالح انقلاب امت مسلمہ کی سرفروشانہ جدوجہد سے پہلی مرتبہ ریگستانِ عرب میں رونما ہوا۔ جسکی نورانی شعاعوں نے مشرق و مغرب کو منور کیا۔ اور اس انقلاب کے بعد ہی دنیا جمہوریت و مساوات اور حریت و آزادی کے نام سے

آشنا ہوئی۔ مگر دنیا کے انسانیت کی شومی قسمت کا ماتم کرنا چاہئے
 کہ خود در امتِ عربیہ کے ہاتھوں انسانیت کی یہ مقدس امانت
 پیوند خاک ہو کر رہ گئی۔

آنچہ تو باخوشی کردی کس نہ کرد
 روح پاکِ مصطفیٰ آمد بدرد

آج نظام اسلامی کی عملی تشکیل کیسے ہو سکتی ہے؟

زوالِ امت کے ابتدائی دور سے زمانہ حاضر تک ملت کے اجتماعی نظام میں جس قدر مفاسد رونما ہوئے ہیں۔ اگر ہم انکی عددی کثرت کو ایک جامع اور کلی مفہوم کے اندر سمیٹنا چاہیں تو وہ مفہوم یقیناً یہی ہو سکتا ہے جسے ”مسلمانوں کا فکری اور عملی انتشار“۔ بلاشبہ اسبابِ فساد و ہر دو الگ الگ ہیں۔ اور ان کے اثرات بھی بظاہر جدا جدا ہیں۔ لیکن ان تمام اثرات کا حاصل یہی مفہوم کلی ہے۔ چنانچہ نسلی اور قبیلوی عصبیت کا پہلا اثر یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے اجتماعی اور ملی فکر و عمل میں اختلاف پیدا کیا۔ ملوکیت کا پہلا خطہ مسلمانوں کی وحدتِ فکر و عمل پر ہی ہوا۔ اعتقادی تعصب اور سیاسی تحزب کا اولین نتیجہ بھی اسکے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر غیر اسلامی علوم و افکار کا تسلط ان کی وحدتِ فکر و عمل کے لئے ذہریلاہن سے کم نہیں ہے۔

اس سے انکار نہیں... کہ یہ مرض بہت دیرینہ ہے اور اسلامی تاریخ کے پروردگار میں اصحابِ دعوت و تجدید اس مرض کی تدبیر و اصلاح کی لگاتار

کوشش و سعی کرتے رہے ہیں۔ اور گاہے گاہے وہ جزوی طور پر اس میں کامیاب ہوتے رہے ہیں۔ مگر اس مرض کے اسباب جنکی عمومی تعبیر ہوا و شہوات کی قرآنی اصطلاح ہی سے ہو سکتی ہے۔ کچھ ایسے صدمی اور سخت جاں واقع ہوئے ہیں کہ وہ ہر دفعہ کی شکست و سختی کے بعد از سر نو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اور آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں۔ اس میں وہ عین دور شباب میں قدم رکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سبب مرض جس قدر قوی اور طاقتور ہوتا ہے، مرض بھی اسی تناسب سے شدید اور مہلک ہوتا ہے۔ جو مریض کو خطرناک عوارض سے دوچار کرتا ہے۔ چنانچہ عصر حاضر کا مسلمان نہایت شدید طور پر اس مہلک مرض (فکری تضاد اور عملی انتشار) میں مبتلا ہے۔ اور آج اگر کوئی شخصیت یا جماعت ملت کے اس مرض (جو اسکے جسم کے ایک ایک ریشے میں اثر کر چکا ہے) کے علاج کے لئے اٹھے گی۔ تو اس کو دور ماضی کے اہمہ دعوت و ارشاد سے کہیں زیادہ عزم و ثبات اور صبر و استقلال سے کام کرنا پڑے گا۔ مگر شدت مرض کو دیکھ کر یا اس تو میدی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر معالج کی نگاہ دور رس ہوگی اور وہ مریض کے مخصوص مزاج کی تشخیص، سوء مزاج کے ارتقائی مراحل کی تعیین اصل مرض اور عوارض مرض کے امتیاز کے بعد تدبیر و علاج کے طرز و طریق اور نسخہ کی تجویز میں غلطی کا ارتکاب نہ کرے گا۔ تو اب بھی مریض کا صحت یاب ہونا کچھ مشکل نہیں ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ آج تدبیر و اصلاح اور

تجویز دوا کے بجائے مرض کا علاج دوسرے مرض سے کیا جا رہا ہے۔
اور اس عجیب و غریب طریق علاج کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ہمارے
سامنے ہے۔

آج ہمارے سامنے اُمت کی تعمیر جدید کا مشکل ترین مسئلہ درپیش ہے
جسکو حل کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک طریقہ وہ ہے جس پر آج دنیا
کی دوسری قومیں عمل کر رہی ہیں۔ یعنی تعمیر انسانیت کا مادی طریقہ کار۔
اور دوسرا طریقہ وہ ہے جو اپنا بتدار آفرینش سے انبیاء و رسل، اور
انکے ماننے والے عمل پر استہانت ہے۔ یعنی اخلاقی بنیادوں پر انسانیت
کی تعمیر۔ اب ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ان دونوں طریقوں کے نظریہ
علمی اور عملی موافقت کا تجزیہ کریں۔ اور ان کے نفع و ضرر پر تحقیقی نگاہ
ڈالیں اور انتہائی حزم و انبساط اور اجتهاد و بصیرت سے ان مختلف
راہوں میں سے کوئی ایک راہ اختیار کریں۔

یہ دو طریقے دو الگ الگ نظریہ ہائے زندگی پر مبنی ہیں۔ پہلے طریقہ
کی اساس خالص مادی تصور زندگی پر ہے۔ اور دوسرا طریقہ اخلاقی
اور مابعد الطبیعی تصور حیات پر مبنی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم ان دو
طریقوں میں سے کون سا طریقہ اختیار کریں۔ اول الذکر طریقہ سے ہم
ایک معتدل اور متوازن معاشرہ کی تشکیل میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔
یا ثانی الذکر طریقہ ہے۔ یا ان دونوں کے خاص خاص اجزا کی ترکیب
سے ایک نئے اور مخلوط لائحہ عمل ترتیب کرنے سے؛ مگر اس فکر کی کاوش

سے پہلے اور ان دو طریقوں کی افادیت و عدم افادیت سے قطع نظر سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنا مقام و منصب اور مقصد زندگی متعین کریں۔ یعنی ہم جب کسی تعمیری پروگرام یا نظام اجتماع کو اختیار کرنا چاہتے ہیں، تو اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس امر کے متعلق دو ٹوک فیصلہ کریں کہ ہماری حیثیت مسلمان کی ہے یا نامسلمان کی! اور یہ کہ ہم مسلمان کی حیثیت سے حیات اجتماعیہ کے تعمیری مراحل طے کرنا چاہتے ہیں یا غیر مسلم کی حیثیت سے؟ ہر صورت میں ہمیں ایک نہ ایک مقصد زندگی متعین کرنا پڑے گا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو اس مقصد سے متاسبت نامہ رکھتا ہو۔ یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ہے کہ ہم اپنے سفر کی ایک منزل مقصود متعین کرتے ہیں۔ اور پھر اس مقصد کی جانب رخ کرنے کے بجائے بالکل اسکی مخالفت سمت کی طرف دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح یقیناً ہمارا ہر قدم ہمیں منزل مقصود سے ہٹا کر پیچھے کی طرف لے جائیگا۔

اس سلسلہ میں عقل و نقل اور واقعات کی شہادت کافی ہے کہ کسی قوم کا سیاسی معاشی اور عمرانی غلبہ و اقتدار اور ذہنی اخلاقی اور ثقافتی ارتقاء محض بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہوا کرتا بلکہ اسکے پس پردہ عوامل و اسباب کا ایک وسیع سلسلہ موجود ہوتا ہے۔ یعنی اس سے پہلے کہ اس قوم کے ذریعہ کوئی اخلاقی، معاشی یا سیاسی انقلاب بپا ہوا وہ

دوسری قوموں کو چھپے ڈھکیل کر اقتدارِ اعلیٰ کے سیٹیج پر قابض ہو، اسکو
 کئی ایک مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ مراحل کچھ تو قوم کے ذہنی شعور
 اور وجدانی احساس سے متعلق ہیں اور کچھ اسکے قواعد عمل سے ایہ مراحل
 کیا ہیں؟ توحیدِ مقصد۔ مقصد کی لگن اور اس کی افادیت کا غیر متزلزل
 یقین اور آئینی نظم کے تحت اس مقصد کی راہ میں پر خلوص جدوجہد۔ آپ
 قرآن حکیم کو اس معاملہ میں شاہد بنائیں یا عقل کو اپنا حکم تسلیم کریں، یا
 اقوامِ عالم کے تذکروں کو اپنا رہنما بنائیں، یہ تینوں ایک زبان ہو کہ
 یہ فیصلہ سنانے کے لئے اس دنیا میں ان تین امور کے سوا کسی انسانی جماعت
 نے کوئی مقامِ شرف حاصل نہیں کیا۔

قرآن، عقل اور تاریخ کو مخاطبین کی رعایت کی خاطر جدا جدا سند
 قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت میں یہ تینوں الگ الگ نہیں ہیں۔ اصل سند
 (انتھارٹی) قرآن حکیم ہی ہے۔ جو علوم یقینیہ کا ماخذ ہے۔ عقل اسکے
 حقائق کو ہر زمانہ کے ماحول پر منطبق کرنے میں مدد دیتی ہے، اور قرآنی
 حقائق و معانی کے خارجی اور کائناتی مظاہر کو تذکرہ و تاریخ کا نام دیا
 گیا ہے۔ اسلئے عقل سلیم کا کوئی فیصلہ قرآن حکیم کے خلاف نہیں ہوتا
 اور تاریخ کا کوئی واقعہ ”سنۃ اللہ“ یا ”فیصلت اللہ“ (جسکی طرف قرآن
 ہی توجہ دینی کرتا ہے) کے خلاف عالم وجود میں نہیں آتا۔

یہ ہر حال ہم جب ملت کی تعمیرِ جدید کا عزم رکھتے ہیں تو سب سے پہلے ہم
 اپنی حیثیت متعین کریں گے کہ ہم بحیثیت مسلمان کے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟

اگر یہ بات ہے تو پھر ہمارا مقصد حیات عصر حاضر کی دوسری قوموں کے بالکل الگ اور اس مقصد کے حصول کا طریق کار دوسروں سے قطعی مختلف ہوگا۔ کیونکہ ہم جب اسلامی تصور زندگی سے اپنے تئیں منسوب کرتے ہیں۔ تو اسکا مطلب بجز اسکے اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس متعین نظریہ زندگی سے ہمیں گہری عقیدت ہے اور اسکی افادیت پر ہم یقین رکھتے ہیں۔ اس ایمان و یقین کا قدرتی اقتضا یہی ہو سکتا ہے کہ جو نظام حیات اس نظریہ پر مبنی ہے ہم اس پورے نظام کو اپنی پوری زندگی میں دخل بنائیں۔ اسکے ایک ایک مطالبہ کی تکمیل کے لئے ہم اپنے آپ کو آمادہ کریں۔ اور اسکی ہر شق کو زندگی کے اُس زاویہ پر منطبق کریں جو اس شق کا معروض ہے۔ یہ پرلے درجہ کی منافقت ہے کہ ہم زبانی طور پر اسلامی نظریہ زندگی سے اپنی عقیدت کا اظہار کریں۔ اور عملی لحاظ سے اسکے نظام اجتماع و تمدن اور معیشت و سیاست سے اپنے آپکو دور رکھیں۔ آخر آپ زبان سے جس کی عقیدت کا اعلان کرتے ہیں اسکو اپنی عملی زندگی میں جگہ نہ دینے کا اسکے سوا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ آپکا دل اس چیز کی محبت و عقیدت سے خالی ہے۔ اور محض نمائشی طور پر یا کسی خاص مصلحت کے پیش نظر آپ یونہی اسکی عقیدت کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو پھر اس سے بہتر یہ ہے کہ آپ علی الاعلان اسلامی نظریہ زندگی سے انکار کریں۔ اور اپنی قوم کو کسی دوسرے نظریہ زندگی پر اکٹھا کریں۔ اس جوأت مندانہ اقدام سے اور نہیں تو

کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہو گا کہ آپ کی قوم مادی طور پر دوسری قوموں کی طرح ترقی کر سکے گی۔ کیونکہ اس صورت میں پوری قوم کے سامنے ایک واضح اور غیر مبہم مادی یا قومی نصب العین ہو گا۔ مگر اس صورت میں جبکہ آپ کے دل و دماغ کا فرانہ تصور زندگی سے متاثر ہیں۔ اور زبان سے آپ اسلام کے تصور حیات کی عقیدت کا اعلان کر رہے ہیں۔ قدرتی طور پر قوم میں فکری اور ذہنی تخریب و انتشار اور اسکے قوی عمل میں ضعف و اضمحلال پیدا ہو گا۔

محض سطحی نظر رکھنے والا شخص بھی اتنی بات سمجھ سکتا ہے کہ جس قوم کے اصحاب حل و عقد نے اپنے لئے درپردہ ایک منزل مقصود متعین کر رکھی ہو، اور وہ جب اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوں تو اس کو اس منزل کی راہ و رسم سے نا آشنا رکھا ایک دوسری منزل کی نشان دہی کرتے ہوں تو اس سے لازماً قوم ذہنی اور فکری اعتبار سے دو یا دو سے زائد گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک گروہ کالج لندن اور واشنگٹن کی طرف ہے۔ دوسرے کا ماسکو کی جانب اور تیسرے کا کعبۃ اللہ کی سمت کو باظاہر ہے کہ جو قوم اپنے سامنے کوئی واضح اور متعین مقصد نہ رکھتی ہو، بلکہ مقصدی لحاظ سے اس کے افراد میں کسی طرح کی ہم آہنگی نہ ہو اس کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ

خسر الدنیا والآخرۃ، ذالک هو الخسران المبین

کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ عصر حاضر کے معروف نظام ہائے سیاست و اجتماع کے خاص خاص اجزا کو ملا کر ایک جدید نظام اجتماع مرتب کیا جائے جس میں کچھ اسلامی اصول سیاست و معیشت کے لئے بھی گنجائش رکھی جائے۔ اور پھر اس پر اسلامی نظام سیاست کا لیبل لگا دیا جائے۔ اس چالاکى سے عوام کو مطمئن کر دیا جائے گا۔ اور خود ارباب سیاست کو اپنا رخ پلٹنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ بلکہ جس طرف کو وہ جانا چاہتے ہیں، بے روک ٹوک بڑھتے جائینگے۔

یہ اتنی بڑی حماقت ہے کہ اس سے بڑی حماقت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل ہر فلسفہ زندگی ایک مستقل اور الگ تھلاک نظام حیات کی تشکیل کرتا ہے۔ اور وہ اس نظام کے مختلف اجزا میں نظم و ترتیب پیدا کر کے اسکو ایک مخصوص طبیعت اور مخصوص مزاج عطا کرتا ہے۔ اور پھر اس خارجی نظام کی مخصوص فطرت اور مزاج کے مطابق ہی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ اشتراکی نظام کا تجزیہ کریں گے تو اسکے ہر جزو میں وہ مخصوص تصور زندگی یعنی معاشی مساوات کا تصور جو فلسفہ اشتراکیت کا محور ہے، کارفرما نظر آئیگا۔ اور یہ نظام جو اس فلسفہ زندگی پر مبنی ہے اپنے فطری اور طبعی اقتضا سے کم و بیش مطلوبہ نتائج پیدا کرے گا۔ اسی طرح اسلامی نظام کا تجزیہ کیجئے، تو اسکے ہر جزو میں اسلام کا اخلاقی اور مابعد الطبعی تصور روح کی طرح جاری و ساری نظر آئیگا۔

بالفاظ دیگر اول الذکر نظام حیات میں حیات اجتماعیہ انسانیہ کے صرف خارجی اور مادی احوال و شئون کے ارتقا کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اور دوسرے نظام میں تصفیہ روح اور تہذیب النفس کو اولین مقام دیا گیا ہے۔ گویا ان میں سے کسی ایک نظام کو قبول کرنا، دوسرے کی نفی کو مستلزم ہے۔ لہذا ان دونوں کو ان کی روح سمیت اگر آپ ماننا چاہتے ہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ آگ اور پانی کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی کوشش کریں۔ اور اگر اسلامی نظام کو مستقل حیثیت سے قبول کر کے اشتراکیت یا مغربی جمہوریت کے مفید اور کارآمد اجزاء کو تابع کی حیثیت سے لینا چاہتے ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ اجزاء نظام اسلامی کی روح پر اثر انداز نہ ہوں۔ بلکہ خود ان میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ نظام متنوع میں کھپ سکیں اور اسکی روح کو قبول کر سکیں، لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ ماصفا اور ماکدہ کی تشخیص و تعین کے لئے آپ کے پاس کیا معیار ہوگا۔ اور اس کام کے لئے آپ کن لوگوں پر اعتماد کریں گے؟

اگر فی الواقع صدق دل سے اور خلوص نیت سے آپ چاہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کی سیاسی، معاشی اور عمرانی ترقی اور اجتماعی و ملی تعمیر اسلامی فلسفہ حیات کے زیر اثر تکمیل پذیر ہو تو اسکے لئے یقیناً قرآنی اصول حکمت کی روشنی میں تعمیری لائحہ عمل اور مکمل دستوری خاکہ مرتب کرنا ہوگا۔ جس میں اول سے آخر تک اسلامی روح کار فرما ہو۔

اور اگر جزئیات و تفصیل مرتب کرنے میں ہمیں دوسرے نظاماتِ سیاست سے مدد لینا پڑے تو اس میں کوئی بُری بات نہیں ہے۔ مگر یہ کام ایسے لوگوں کے حوالے نہیں کیا جاسکتا جو دینی بصیرت اور قرآنی فہم سے بالکل ہی مایہ ہیں۔ اور نہ ان لوگوں پر اکتفا کی جاسکتی ہے جو علوم اسلامیہ سے واقف ہیں۔ لیکن عصر حاضر کے جدید سیاسی تصورات اور بین المللی قانون سے نابلد ہیں۔ بلکہ اس مقصد کے لئے ان دو قسم کے لوگوں کا باہم مخلصانہ تعاون ناگزیر ہے۔

زیر ترقی شخصی اور انفرادی فریضہ نہیں ہے، بلکہ اجتماعی اور ملی فریضہ ہے۔ اور مرکزِ ملت کے توسط سے انجام پذیر ہو سکتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر تعمیری پروگرام یا نظامِ مملکت کی دفعات مرتب کرنا شروع کر دے تو اس سے شدید قسم کا طبقاتی اور جماعتی تصادم رونما ہو گا۔ ہر جماعت ایک الگ تعمیری لائحہ عمل مرتب کر کے اسکی عظمت و یختانی کی قصیدہ خوانی اور دوسری جماعتوں کے تعمیری مسودات کی تنقیض شروع کر دے گی۔ اور اس سے مملکت میں ایک عام ذہنی انتشار پیدا ہو گا۔ اور پھر انفرادی کاوش خواہ کتنی ہی کارآمد اور بیش قیمت کیوں نہ ہو معاصرانہ رقابت سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی کوششیں ثمر باہونے کے بجائے مضر نتائج پیدا کرتی ہے۔

ایک اہم سوال اور اسکا جواب
 کہا جاتا ہے کہ اسلامی نظامِ زندگی کو جو اس وقت محض نظری حیثیت

سے متعارف ہے، جدید مادی ماحول پر کیسے منطبق کیا جاسکتا ہے؟
اس سوال کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ لیکن یہ سوال اٹھانے والے
حضرات اگر اس مسئلہ پر کچھ وسعت نظر سے غور کریں تو اسکا حل اتنا مشکل
نہیں ہے جتنا کہ اسے مشکل سمجھ لیا گیا ہے۔

در اصل ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ اسلامی فلسفہ حیات کو
عملی طور پر جدید مادی ماحول پر کیسے منطبق کیا جاسکتا ہے، بلکہ سوال یہ
ہے کہ اسلامی فلسفہ زندگی کے ذریعہ اس خالص مادی ماحول کو کس طرح
بدلا جاسکتا ہے؟ جس سے نظام اسلامی اور ہمارے ماحول میں ہم آہنگی
پیدا ہو سکے۔ اگر آپ موجودہ غیر متوازن اور غیر صالح ماحول کو جوں کا
توں برقرار رکھ کر اسلامی نظام کو اس پر حاوی کرنا چاہتے ہیں تو بلاشبہ
یہ کام غیر ممکن ہے۔ کیونکہ نظام اسلامی کا لباس کسی ایسے بد وضع، غیر
متوازن اور متجاوز القامت جسم کے لئے بنا ہی نہیں ہے۔ نظام اسلامی
کا عملی نفاذ سب سے پہلے معاشرہ کے غیر فطری نشیب و فراز ہی سے توجہ
کر لگنا۔ اور اسکو ایک ہموار اور متوازن شکل و صورت عطا کر لگنا۔

در اصل موجودہ مسلمان عصر حاضر کے تہذیبی اور تمدنی ارتقا سے کچھ اس
طرح مرعوب ہو چکا ہے کہ اسکے مقابلہ میں اسکو اپنی ہر چیز حقیر نظر آتی ہے
مگر وہ اس حقیقت سے آج تک بے خبر ہے، جس کو خود اہل فرنگ کے
بہت سے بالغ النظر اور منجیدہ فکر لوگوں نے آج محسوس کر لیا ہے۔ وہ
حقیقت یہ ہے کہ تہذیب حاضر کی عظمت و ترقی کی رفتار بلاشبہ

حیران کن ہے۔ مگر یہ رفتار ترقی انسانیت کے لئے قابل فخر نہیں ہے بلکہ باعث صد عار ہے۔ انسانیت کو ایسے تمدنی ارتقا کی ضرورت ہے جو تمام انسانی قوی کو کمال کی طرف لے جائے اور فضائل انسانیت کا کوئی زاویہ اسکی نگر التفات سے محروم نہ ہو۔ مگر تمدن جدید کی حالت یہ ہے کہ اس نے مادی پہلو کے لحاظ سے انسان کو انتہائی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ اور اسکی روحانی صلاحیتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی مجموعی طور پر مستفل اور بربادی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس بنا پر تہذیب جدید کی ارتقائی حرکت غیر متوازن اور سراپا ہلاکت آفریں ہے۔ اور حق یہ ہے کہ آج انسانوں کو اس خطرہ سے ہٹا کر فکر و عمل کی صراط مستقیم کی طرف لے جانا ہی انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اور یہ کام جتنا دقت طلب اور کٹھن ہے اتنا ہی شاندار نتائج کا حامل ہے۔

حاصل یہ ہے کہ ذہنی طوائف الملوکی اور عملی انتشار کے اس ہیجانی دور میں سب سے پہلے معاشرہ کے تمام اجزاء فکر و عمل پر حکیمانہ نگاہ ڈالنی چاہئے اور انتہائی محنت و تقصیر سے اسکے بیمار جسم کے ایک ایک عضو کا تشخصی معائنہ کرنا چاہئے۔ جو حصے صحت مند اور کارآمد ہیں ان کو باقی رہنے دیا جائے۔ اور جو حصے معمولی تدبیر و اصلاح سے کارآمد ہو سکتے ہیں ان کی اصلاح پر ہی ارتقا کی جائے اور جو حصے جراثیم زدہ اور سمیت آلود ہیں ان کو کاٹ کر پھینک دیا جائے۔

اس معالجاتی عمل کے بعد ہمارے ماحول کا مادی پھیلاؤ یقیناً سمٹ جائے گا۔ لیکن وہ روحانی فیوض و کمالات کی مدد سے بجا طور پر صحت مند متوازن اور پُر امن نظام تمدن کا ساتھ دے سکے گا۔ اور پھر اس جدید تمدن کی ارتقائی حرکت ایک طرفہ نہیں ہوگی، بلکہ انسانیت کے تمام ذہنی، روحانی اور عملی کمالات سے ہم آہنگ ہوگی۔ اس لئے یہ ہلاکت آفریں ہونے کے بجائے دنیاۓ انسانیت کے لئے سراپا رحمت ہوگی۔

بہر حال ہمیں جب مقصد کی افادیت کا کامل یقین ہوگا اور اپنی عزم کے ساتھ اسکے حصول کی جدوجہد کا آغاز کریں گے تو پیش آنے والے جدید مسائل کا حل بھی ساتھ ساتھ ہی نکلتا جائے گا۔ لیکن اگر ابتدا ہی سے ہمارا یقین متزلزل ہے۔ اور آغاز کار سے پہلے ہی ہم کسی ایسے نظام حیات کا مطالبہ کرتے ہیں جو روز اول ہی سے تمام جزئیات و تفصیل پر حاوی ہو، تو یہ کام دشوار ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہے، اور پھر آپ کوئی ایسا نظام سیاست پیش کر سکتے ہیں جو یک لخت تمام تفصیلی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہو؟ جب حالاتِ زمانہ اور ماحول ہر لمحہ رو بہ تغیر ہیں، تو ہر نظامِ زندگی کے تفصیلی جزئیات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک نظامِ اسلامی کے بنیادی تصورات کا تعلق ہے۔ وہ ہر لحاظ سے جامع اور مکمل ہیں۔ غرض یقین محکم اور عزم صمیم کے سوا کسی نظریہ زندگی کو عملی حیثیت

سے ہرگز روشناس نہیں کرایا جاسکتا، اور نہ ہی اُس کو گرد و پیش کے
مادی ماحول پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔

دورِ ماضی کی تعمیری اور انقلابی کوششوں کے

ایک تنقیدی نظر!

گذشتہ باب میں پیغمبرانہ دعوت و انقلاب کے اصول و مبادی کتاب دست کی روشنی میں بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ ان سے مستقبل کی تعمیر جدید کے کام میں استفادہ کیا جاسکے۔ لیکن قبل اسکے کہ ہم عہدِ حاضر کے اجتماعی مفاسد کے پیش نظر انقلابی جدوجہد کی نوعیت متعین کریں۔ یہ ضروری ہے کہ دورِ ماضی کی تعمیری اور انقلابی کوششوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تاکہ ہم یہ اندازہ کر سکیں کہ تاریخ کے ہر دور میں اجتماعی تحریکوں سے جو نتائج برآمد ہوئے اور تجدیدی شخصیتوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان سے ملت کو کیا کیا فائدے پہنچے۔ اور دورِ حاضر کی اصلاحی تعمیری اور انقلابی جدوجہد میں ہم ان کے کارناموں سے کس حد تک فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ نیز ہم یہ بھی معلوم کر سکیں کہ یہ لوگ دعوتِ اقامتِ دین کے ذریعہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ میں کامل اور صالح انقلاب بپا کرنے میں کیوں ناکام رہے ہیں؟ اور ان کی ناکامی کے اسباب و وجوہ

کیا ہیں؟ تاکہ ہم ان اسبابِ ناکامی سے بچ کر آگے کی طرف قدم بڑھا سکیں۔
مگر اس موقع پر ان کوششوں کا احاطہ و استیعاب مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ
اصل مقصد ان کوششوں کی نوعیت متعین کرنا، اور ان سے اصولی بحث
کرنا ہے۔

دورِ ماضی کی ان کوششوں کو ہم تین اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔
(۱) دعوتِ عامہ کی راہ سے محض حصولِ اقتدار کی کوششیں (۲) دعوت
عامہ کے ذریعہ حیاتِ اجتماعیہ میں صالح انقلاب پیدا کرنے کی کوششیں۔
(۳) محض علمی استدلالی اور تعمیری کوششیں۔

دعوتِ عامہ کی راہ سے جاہِ علمی میں بکثرت اٹھتی رہی ہیں۔ اور
اس طرز کی اجتماعی تحریکیں ہر دور

ان کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں دینِ مذہب، حزبی عقائد و افکار
پر سراسر اقتدار طبقہ کے ظلم و تشدد سے گلو خلاصی اور معاشی و سیاسی حریت
و آزادی کے خوشگن اور دلفریب نعروں سے عوام میں اثر و نفوذ پیدا
کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور حکومتِ مسلطہ کا تخت اُلٹنے کی جارحانہ
ہمہ کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اس نوع کی کوششوں کی تعداد اتنی زیادہ
ہے کہ ان کو ضبطِ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ یہاں صرف چند مثالوں پر
ہی اکتفا کی جائیگی۔

کوفہ میں مختار ثقفی نے دعوتِ شروع کی۔ اسکی دعوتِ شیعہ عقیدہ
پر مبنی تھی۔ اس شخص نے عوام میں اثر و رسوخ پیدا کرنے کے لئے حضرت امام حسین

کے واقعہ شہادت کو پر جوش نعرہ کے طور پر استعمال کیا۔ اور یہ امام موسیٰ کے انتقام اور محمد بن علی (جو اولاد علی میں سب سے بڑے تھے) کی خلافت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا تھا۔

خواجه کی دعوت بھی اسی نوعیت کی تھی۔ ان کے کچھ مخصوص عقائد تھے جنکو وہ نہایت معصومانہ انداز میں پیش کرتے تھے۔ ان کا نعرہ ” اِنِ الْحُكْمُ لِلّٰهِ ” تھا۔ لیکن اسکی تہ میں ان کی سیاسی اغراض کا رہنما تھیں۔

حمیمہ میں علی بن عبد اللہ بن عباس نے دعوت کا آغاز کیا۔ اور شیعہ کیسائیہ نے اس کا ساتھ دیا۔ اسکی دعوت بھی شیعہ عقیدہ یعنی اہل بیت کی محبت۔ اور ان کے استحقاق خلافت کے تصور پر مبنی تھی۔ لیکن یہ شخص بڑا عقلمند اور سیاست کار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حکومت میں انقلاب لانے کے لئے امت میں ذہنی تبدیلی پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور ناگہانی طور پر جو انقلاب بپا کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ ہمیشہ ضعف و کمزوری اور ناکامی و نامرادی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے باغی اہل طور پر داعی مقرر کئے۔ اور ان کو ملک کے کونے کونے میں بھیجا۔ یہ لوگ اہل بیت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ کوفہ اور خراسان میں اسکی دعوت کے مرکز تھے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کوفہ میں اہل بیت کو ماننے والے زیادہ لوگ ہیں اور خراسانیوں میں نبو امیہ کے خلافت عام نفرت ہے۔ جسے باسانی ابھارا جاسکتا ہے۔ ابو مسلم خراسانی کے شمول سے پہلے دعوت محضہ کا

سلسلہ جاری رہا۔ اور اسکے بعد باقاعدہ فوجی مہم کا آغاز ہوا۔ اور اسکے نتیجہ میں بنو امیہ کا اقتدار ختم ہوا۔ اور بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی جو قریباً چھ سو سال تک جاری رہی۔

اسی طرح محمد بن توہرت جو سوس کا باشندہ اور امام غزالی کا شاگرد تھا۔ ۵۱۵ھ میں اس نے پہلے پہل امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے کام سے دعوت کا آغاز کیا۔ جب مریدین کا حلقہ بڑھنے لگا تو مہدیت کا دعویٰ کیا اسکے مریدین "الموحدون" کے نام سے مشہور تھے۔ اور اس نے اپنے مریدوں کو دس طبقوں میں تقسیم کیا تھا۔ سب سے پہلے دعوت قبول کرنے والے "الجماعۃ" کے نام سے موسوم تھے۔ عبد المؤمن بن علی کو اس نے اپنا پہلا جانشین بنایا۔ یہ شخص بڑا ذہین اور دلیر تھا۔ اسی نے مراکش پر قبضہ کر کے المرابطون کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ محمد بن توہرت کو اس سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ اسکی نسبت اس نے یہ شعر کہے تھے۔

لکنا ملت فیک اخلاق خصصت لہا فکلنا باک مسرور و مغتبط،

فالسن ضاحکة والكف مانحة۔ والصدر منشرح والوجه منبسط،

اسما علیوں کی دعوت بھی اسی زمرہ میں شامل ہے جسکے نتیجہ میں دولت

فاطمیہ کا قیام عمل میں آیا۔

۱۵۔ تجھ میں وہ اخلاق درجہ کمال کو پہنچ گئے ہیں جو تیرے ساتھ ہی مخصوص ہیں پس ہم

سب تیری ذات سے خوش اور تجھ پر رشک کرنے والے ہیں، پس دانت ہنسنے والے ہیں،

ہتھیلی بٹھننے والی، سینہ کھلا ہوا، اور چہرہ کشادہ ہے۔

غرض اس طرح کی اجتماعی تحریکیں ہر زمانہ میں اٹھتی رہی ہیں۔ اور ان کے مفاسد میں سے ایک بڑا اور بنیادی مفسدہ یہ ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں تضاد ہوتا ہے۔ اور دوسرا نقص یہ ہے کہ ان تحریکات کے علمبرداروں نے انقلاب بپا کرنے میں وہ طریق کار اختیار کیا جو غیر مسلموں کے مقابلہ میں کیا جانا چاہئے تھا یعنی حملہ و هجوم اور فوجی اقدام کافر حکومتوں کے مقابلہ میں کیا جاتا ہے۔ اور جہاں ملت کے اندر ہی انقلاب لانا مقصود ہو تو اسکا طریق کار یہ ہے کہ عوام المسلمین کی اصلاح و تعمیر سے رائے عامہ کو منظم کیا جائے اور جمہوری طریقوں سے سیاسی انقلاب بپا کیا جائے کسی گزشتہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس قسم کی تحریکوں سے بے شمار مفاسد کے دروازے کھل گئے اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔

دعوتِ عامہ کے ذریعہ صالح انقلاب بپا کرنے کی کوششیں

اس قسم کی تحریکیں بھی بنو امیہ کے ابتدائی دور سے آج تک چلتی رہی ہیں۔ سب سے پہلے

یزید کی حکومت کے خلاف اہل مدینہ نے علمِ جہاد بلند کیا۔ اسکے نتیجہ میں حرہ کا معرکہ پیش آیا۔ اور مسلم بن عقبہ المری نے داعیان انقلاب کو تہ تیغ کیا۔ واقعہ کربلا، عبداللہ بن زبیر کی دعوت، واقعہ قرآن، جس میں عراق کے علمائے نبی امیہ کے خلاف جنگ آزمائی کی۔ نفسِ زکیہ کا واقعہ جس میں سادات اور علماء حجاز نے مل کر دولت عباسیہ کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا۔ اور اس قسم کی اجتماعی تحریکوں (جن کا مقصد کسی نہ کسی رنگ

میں دینی انقلاب پیدا کرنا اور فساق کے اقتدار کو ختم کرنا تھا، کی ایک بڑی
 حامی یہ تھی کہ ان میں حالات کا ٹھیک ٹھیک جائزہ نہیں لیا گیا اور دعوت
 و اصلاح اور تعمیر فکر کے ذریعہ رائے عامہ کا اعتماد حاصل کئے بغیر ہی انقلابی
 جدوجہد شروع کر دی گئی۔ نیز یہ اصولی نقص یہاں بھی موجود تھا کہ ان لوگوں
 نے حملہ و هجوم اور تشدد کے ذریعہ انقلاب بپا کرنا چاہا۔ حالانکہ ملت کے
 اندر صالح انقلاب بپا کرنے کا یہ طریقہ نہیں تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔
 چنانچہ مرکز ملت کی اطاعت کے باب میں جو صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں،
 ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مرکزیت کا تحفظ و احترام اول
 امیر کی اطاعت اس وقت تک ضروری ہے جب تک کہ امیر واضح
 اور بین کفر کا ارتکاب نہ کرے۔

اَلَا اِنَّ قَدْرًا كَثْرًا بَوَّاحًا عِنْدَ كَرَمِ اللّٰهِ فِيْهِ بَرَهَانٌ (بخاری)

یعنی امراء و حکام خواہ فسق و معصیت اور ظلم و تشدد پر اتر آئیں۔
 لیکن جب تک وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کریں اور کفر صریح کے
 مرتکب نہ ہوں اس وقت تک ان پر خروج کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ
 ملت کی مصلحت عامہ کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی مرکزیت بہ ہر حال
 محفوظ رہنی چاہئے۔ اور کفر و شرک کو چھوڑ کر باقی تمام مفسدات مرکزیت
 اور طوائف الملوکی کی نسبت بہ ہر کیف کم تر ہیں۔ اس لئے مرکزیت کی
 خاطر ان مفسدات کو برداشت کر لینا چاہئے۔ ہاں مسلمانوں کی تعمیر و
 اصلاح اور رائے عامہ کی تنظیم کے ذریعہ صالح انقلاب بپا کرنے کے

دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ اگر اس طریقہ سے کوئی منظم اور اصولی تحریک شروع کی جاتی تو کامیابی یقینی تھی۔ لیکن ایسا نہ کرنے سے فتنوں کے دروازے کھلتے گئے۔

تیسری صدی ہجری میں حضرت سید احمد اور حضرت اسماعیل شہید کی تحریک جہاد و اقامت دین کو اس لحاظ سے مذکورہ تحریکات کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد بھی اعلاء کلمۃ الحق اور احیاء دین تھا۔ لیکن مقصد سے قطع نظر اس تحریک کی نوعیت بالکل الگ تھی یعنی یہ تحریک مسلمان اولی الامر کے مد مقابل نہ تھی۔ بلکہ اہل کفر کے ظالمانہ تسلط کے خلاف چلائی گئی تھی۔ اس لئے یہ تحریک اصولاً بالکل درست تھی اسکے علاوہ اس تحریک جہاد کے علمبرداروں نے خالص اسلامی تصورات کی بنیادوں پر جماعت کو منظم کیا۔ اور پھر احیاء و اقامت دین کے پاکیزہ مقصد کے لئے موزوں مرکز تجویز کیا، اہل کفر سے مسلسل لڑے۔ شروع شروع میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ اور مختصر سے خطہ ارضی میں خلافت علی منہج النبوة قائم کی۔ غرض ان سرستان خمخانہ احدیت اور بلاکشان راہ حریت نے تھوڑی سی مدت میں وہ کچھ کر دکھایا، جس کے لئے اہل نظر صدیوں سے ہمہ تن چشم انتظار تھے۔ مگر کچھ اسباب عادیہ کی وجہ سے انکی یہ کامیابی ناکامی سے بدل کے رہ گئی۔

ان پر جوش اور سراپا خلوص مجاہدین راہ حق کی ظاہری ناکامی کا سبب بڑا سبب ایک ہی ہے کہ مرکز کے استحکام و قوت کے لئے جس طرح کی عملی

اور احتیاطی تدابیر کسی ایسی اصولی تحریک کو جلانے کے لئے ناگزیر ہوتی ہیں، ان کو بروئے کار لانے میں بڑی حد تک بے اعتنائی کی گئی تھی۔ اتنی بڑی مہم کو اسکے کارکنوں کی معمولی سی لغزش سے بسا اوقات اتنا بھاری نقصان اٹھانا بڑا تباہی جسکی تلافی کسی صورت میں ممکن نہیں ہوتی۔ میں نے جہاں تک اس تحریک کا مطالعہ کیا ہے اور اس جماعت کے لیڈروں سے عقیدت و ارادت کا تعلق رکھنے والے قابل اعتماد لوگوں سے جو کچھ سنا ہے اس کے پیش نظر اس تحریک کی ناکامی کے بارے میں میری قطعی رائے یہ ہے کہ ان مردانِ راہِ حق نے ابتداء کار ہی میں پٹھانوں کے کچھ خود غرض اور ہوس پرست پیروں اور ملاؤں پر اتنا اعتماد کیا جسکے وہ ہرگز اہل نہ تھے۔ ان لوگوں کی مومنانہ شکل و صورت اور تقویٰ و مہارت کے ظاہری نقوش کو دیکھ کر یہ خیال کر لیا کہ یہ لوگ اندر سے بھی مخلص ہوں گے۔ اور ان پر اتنا بھروسہ کیا کہ ان کو تحریک کی ہائی کمان میں شامل کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت کے راز ہائے سرسبز ان بندگانِ ہوس کے ذریعہ افشا ہونے لگے۔ میرا خیال ہے کہ خوانین سرحد کی مسلح بغاوت اور مجاہدین کا قتل عام ان لوگوں کے دیہات سے ہوا۔ چنانچہ ذیل کے قرائن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ بعد میں سرکارِ برطانیہ نے اس طرز کے پیروں اور پرست ملاؤں ہی کے ذریعہ سے اس تحریک کے علمبرداروں کو کافر، اور وہابی ثابت کرنے کی مہم شروع کی۔ اور اس میں اسکو بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کو ناکام بنانے میں ان بندگانِ نفس نے جو پارٹ ادا کیا یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ تاریخ کے ہر دور میں مذہب اور دین کو ذریعہ معاش بنانے والے، تسبیح و سجادہ کی آڑ میں شکار کھیلنے والے اور کتاب اللہ کو بیچ بیچ کر کھانے والے اہل خانقاہ اور اہل مدرسہ یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں۔ اور آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ دین اور ملت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو انکی دست درازوں سے مجروح نہ ہوا ہو، کبھی یہ ملوک و سلاطین کے آدے کار بنے، اور اہل حق کو ان کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ کبھی اہل کلیسا سے ساز باز کی اور ان کے اقتدار کے لئے دعائیں مانگیں، اور کبھی اہل دہم کے حاشیہ بردار بن کر ان کی قصیدہ خوانی کی۔

گا ہے اور ابا کلیسا ساز باز گا ہے او بادیریاں اندر باز
دین او آئین او سوداگری است عنبری اندر لباس حیدری است (قبائل)

حاصل یہ ہے کہ اس تحریک جہاد کے رہنا اگر تپہ خلوں و ایمان کے پیکر تھے۔ اور ہم جب ان کے مجیر العقول کا ناموں کو دیکھتے ہیں تو بے ساختہ ہماری توجہ تیرہ سو سال پیچھے کی طرف پھر جاتی ہے۔ اور بلاشبہ ان لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی سیرت قابل رشک تھی۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چھوٹے بڑے واقعہ کے پیچھے علل و اسباب کا وسیع سلسلہ کار فرما ہوتا ہے۔ ایک تاجر لاکھوں کے سرمایہ سے تجارت شروع کرتا ہے تو محض اس کا خلیوص و ایمان اسکی کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اصول تجارت اور اسباب و وسائل سے کام نہ لے ورنہ

ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اُسکو ناکامی سے نہیں بچا سکتی۔
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اقامتِ دین کے لئے مدینہ
 منورہ کو مرکز بنایا۔ وہاں پہنچ کر آپ نے ایک نہایت مختصر سی ریاست
 قائم کی، مدینہ کی آبادی کا ایک موثر عنصر یہود تھے۔ ان سے جاتے ہی
 باقاعدہ معاہدہ کیا۔ تاکہ ان کی شرارتیں محدود ہو جائیں۔ مسلمانوں
 کی اصلاح و تنظیم میں پوری قوت صرف فرمائی۔ اور جو لوگ کئی مرتبہ
 امتحان و آزمائش کی بھٹی میں بڑ کر نکھر چکے تھے۔ صرف ان کو اعتماد کا
 اہل تصور کیا۔ خبیثت اور طیب کا امتیاز کرنے میں انتہائی محنت و توجہ
 سے کام لیا اور اس طرح چند مخلص مسلمانوں کی مختصر سی فوج تیار کی۔
 جس نے ایران و روم کی مہذب اور طاقتور سلطنتوں کو تہ و بالا کر دیا۔
 اسی طرح اگر تیرہویں صدی کے ان مردانِ حق کی یہ مقدس جماعت
 ان پیروں اور ملاؤں کو جانچ تول اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر ان پر اعتماد
 کرتی تو حالات کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

علمی، انتہائی اور تعمیری جدوجہد | جب ہماری نگاہ تجسس ماضی کی
 طرف اٹھتی ہے تو ایک طرف دین

و مذہب کے پردے میں جنگِ اقتدار اور تاویل و تحریف کے ذریعہ قرآنی
 اصول و احکام کو مسخ کرنے کی ناپاک کوششوں کا ایک خوفناک منظر
 سامنے آجاتا ہے۔ اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ رب العزت کی
 طرف سے اربابِ عزیمت کے ذریعہ تجدید و احیاء دین کا مسلسل اہتمام

ہو رہا ہے۔ جب بھی بندگان ہوں اور پرستاران باطل کوئی نیا ملت نہ کھڑا کرتے ہیں تو کوئی مرد حق اٹھ کھڑا ہوتا ہے، جسکی ایک ہی ضرب سے باطل کے پرزے اڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ حق و باطل اور اسلام و جاہلیت کی یہ آویزش ہر زمانہ میں برابر جاری رہی ہے۔ اور آئندہ بھی جاری رہے گی اور کتنے خوش بخت ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو خطرات و مہالاک میں ڈال کر اسلام کو جاہلیت کے حملہ و یحیوم سے بچایا۔ اور اسلامی اصول و نظریات کو از سر نو اجاگر کیا۔

بنا کردند خوش سے بجاک و خون غلطین

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

اس نوع کی کوششیں جن لوگوں کی طرف سے عمل میں آتی رہی ہیں ان کی پوری تعداد اور ان کے جراحدا کارناموں سے بحث کرنا بڑا محنت طلب اور مشکل کام ہے۔ اور پھر یہ ایک مستقل موضوع بحث ہے۔ جس کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں محض چند مثالوں پر ہی اکتفا کی جائیگی۔

عباسیہ کے دور میں الحاد و بے دینی کا ایک طوفان اٹھا۔ اور بڑے بڑے ارباب علم و تقویٰ خس و خاشاک کی طرح اس میں بہ گئے۔ بڑے لکھے لوگوں کا کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جو فلسفہ یونان کے ادہام و خرافات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اہل اختزال اور اہل فلسفہ نے دین کو عقل کا غلام بنا دیا تھا۔ اور دینی نظام فکر و عمل کو بالکل محرف کر دیا تھا۔ ان حالات

میں حضرت امام احمد بن حنبل، امام غزالی اور شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ پیدا ہوئے، جنہوں نے اس نئے فتنہ کو مٹانے میں سر دھڑکی بازی لگائی اس نازک وقت میں جبکہ کلمہ حق کہنے کی سزا موت تھی یا کم از کم جیل اور کوڑوں کی مار، ان مردانِ حرا اور بلاکشانِ راہِ عزیمت نے صدائے حق بلند کی اور ان کی پیہم کوششوں سے اہل الحاد و زندقہ کے ناپاک منصوبے ناکام ہو سکے۔ یہ گئے۔

امام احمد بن حنبل ایک جلیل القدر امام حدیث اور بلند پایہ مجتہد تھے انہوں نے علمی طور پر وہی کام کیا جو دوسرے ائمہ قانون و فقہ نے کیا ہے مگر اس لحاظ سے ان کو نمایاں حیثیت حاصل ہے کہ ان کے غیر مترادل عزم و یقین اور محیر العقول قوتِ کردار نے امت کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کیا اور اس میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ یہاں دوسرے ائمہ دین کی تنقیص منقصو نہیں ہے۔ انہوں نے جو بلند پایہ علمی خدمات انجام دی ہیں، امت کی گردنِ شکر ہمیشہ ان کے احسان سے زیر بار رہی۔ امت کی ذہنی اصلاح و تعمیر میں انہوں نے غیر معمولی طور پر حصہ لیا اور راہِ حق میں مصیبتیں برداشت کیں۔ اور انکے علمی کارنامے آج بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ لیکن اسلام کے اس بطلِ جلیل اور علمبردارِ علومِ نبوت نے راہِ حق میں جو آلام و مصائب برداشت کئے ان کے تصور ہی سے جگر کانپ اٹھتا ہے۔ تین بادشاہوں، مامون، معتصم اور واثق کے زمانہ میں ان پر مسلسل کوڑوں کی بارش ہوتی رہی۔ اور

اس مردِ حق نے اتنے شدائد و مظالم برداشت کئے کہ پہاڑ بھی انکی تاب نہ لاسکیں، ان کی جلالتِ شان کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ جو ان کے ایک معاصر صاحبِ علم و تقویٰ کی زبان سے انکی نسبت نکلے تھے۔
 قاضی احمد صفاہ الانبیا احمد انبیا کے مقام پر کھڑا ہے۔

آخر حضرت امام کی جانثارانہ جدوجہد فتنہ اعتراف کو ختم کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی۔ اور متوکل کے زمانہ میں صورت حال بالکل بدل گئی۔

جمہور الاسلام امام غزالی نے یونانی عقلیات پر شدید نکتہ چینی کی اسکے بڑھتے ہوئے اثر و وقار کو ختم کیا۔ اور صحیح عقلی بنیادوں پر اسلام کے نظامِ فکر و عمل کو ترتیب دیا۔ ان سے پہلے فلسفہ یونان کا اثر و نفوذ بڑھ رہا تھا۔ مگر ان کی علمی اور استدلالی کوششوں نے مسلمانوں کو از سر نو کتاب و سنت کی طرف متوجہ کیا۔ اس زمانہ کے متصوفین اور اہل مدرسہ کی اصلاح کے لئے بھی انہوں نے جدوجہد کی۔ مگر ان کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سعی اصلاح کچھ زیادہ بیابانِ داعی اور نکھری ہوئی نہ تھی۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی علمی اور تصنیفی خدمات اس لحاظ سے بہت اونچا مقام رکھتی ہیں کہ انہوں نے معاشرہ کے ایک ایک مرض کی نشان دہی کی۔ جسمِ ملت میں جہاں جہاں اُن کو ابھرا ہوا ناسور نظر آیا وہاں بے باکانہ نشتر سید کیا۔ اہل خانقاہ کے سراپا غلط تصورات

پر سخت تنقید کی، اپنی بدعت کی ہوا پرستیوں اور ان کی مشرکانہ رسوم و بدعات کی پوری قوت سے مخالفت کی۔ فلاسفہ اور دیگر فرق باطلہ کے عقائد و افکار کی نہایت موثر انداز میں تردید کی، دنیا پرست اور لالچی علماء و صوفیا کی غلط کاریوں کو بے نقاب کیا۔ جہالت و غواہیت کے دبیز پردے جو علوم قرآنی پر ان لوگوں نے ڈال رکھے تھے، ان کو چاک کیا۔ اور کتاب و سنت کے حقائق ان کے قلمی جہاد سے ایک دفعہ پھر نکھر کر سامنے آ گئے۔

احمد بن تیمیہ بلا کے ذہین تھے۔ زبان میں جادو کا اثر تھا۔ قلم میں بے پناہ طاقت تھی۔ اور ساتھ ہی میدان جہاد کے شہسوار تھے۔ ان کی علمی کوششوں نے قلوب و اذہان کو غلط عقائد اور وساوس شیطانی سے پاک کیا۔ اور یورپ تاتاریوں میں جب مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو چکی تھیں۔ اور وہ تاتاریوں کا نام سن کر سہم جاتے تھے۔ علامہ موصوف کی شعوبہ بیانی نے ان کے دلوں میں جوش جہاد پیدا کیا۔ میدان جنگ میں خود ہی عساکر اسلامی کی رہنمائی کی بلکہ نڈر اور بے باک سپاہی بن کر تاتاریوں کے خلاف اس زور سے لڑے کہ ان کے حملوں کو پیا کر دیا ان کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کہ علماء دین کا کام صرف درس و افتاء اور تصنیف و تالیف ہی نہیں ہے بلکہ جب ملت اسلامیہ خطر است و مہالاک میں گھر جائے تو ان کا کام یہ بھی ہونا چاہئے کہ وہ میدانِ کارزار میں نکل کر دادِ شجاعت دیں۔

ولامتال بغیر السیف منزلة ولا ترد صدور الخیل بالکتاب
 گیا، ہویں صدی ہجری میں ایک عظیم المرتبت شخصیت پیدا ہوئی جو
 دنیا سے اسلام میں مجدد الف ثانی کے نام سے متعارف ہے۔ یہ وہ
 زمانہ تھا جبکہ دینی اخطا و غلطی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ اور اسلامی عقائد
 و افکار کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں۔ اکبر کی تحریک اتحاد و بے دینی
 نے دین خداوندی کی عظمت دلوں سے بالکل ختم کر دی تھی اور شعائر
 اسلامی کی علی الاعلان توہین و تذلیل ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس زمانہ
 میں اسلام اور مسلمان کا نام باعث تنگ و غار تھا۔ اور یہ دیکھ کر لوگ
 اسلام سے برگشتہ ہو رہے تھے۔

دوسری طرف علما دین اور متصوفین کے گروہ تھے جو اسلام کی حقیقی
 روح سے یکسر تہی ما یہ تھے۔ کتاب و سنت سے کسی کا تعلق باقی نہ رہا تھا
 علماء صرف فقہی موشگافیوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ اور اسی کو وہ دین
 تصور کرتے تھے۔ اہل تصوف کے یہاں شرک و بدعت کا عام رواج تھا
 اور انہوں نے اسلامی تصوف کو بالکل ہندی یوگ اور ویدانت ازم
 بنا دیا تھا۔ ان حالات میں حضرت مجدد سرہندی کے کار تجدید کی ابتدا
 ہوئی اور انہوں نے کمال جرأت سے ان غلط کارگروہوں کی اصلاح کا
 بیڑا اٹھایا۔ علماء کو از سر نو کتاب و سنت کی طرف متوجہ کیا۔ صوفیہ کے
 غیر اسلامی افکار و اعمال اور شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریہ وحدت
 الوجود پر شدید نکتہ چینی کی۔ اور دین اکبری کی وجہ سے حکومت اور
 سلہ ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود سے اس وقت کے متصوفین بے سہما۔

عوام میں جو مفسد پیدا ہو گئے تھے، انکی اصلاح کی۔ یہاں تک کہ انکی پر خلوص اور موثر جد و بہد نے اکبر اور جہانگیر کے پروردہ "دین الہی" کی جو لیں بلا دیں۔ غیر اسلامی موسوم و بدعات کو یکسر ختم کیا اور حکومت کا رخ از سر نو اسلام کی طرف پھیر دیا۔

حضرت مجددی سے ایک سو سال بعد جبکہ حکومت مغلیہ بستر مرگ پر اڑیاں رگڑ رہی تھی، اہل حکومت، علماء و مشائخ اور عوام خطرناک ذہنی اور عملی انحطاط و تسفل میں پڑ چکے تھے۔ اور دین کی حقیقی روح بالکل ناپید ہو چکی تھی، ایک جلیل القدر اور بالغ النظر اسلامی مفکر حضرت امام ولی اللہؒ پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے انتہائی گہری نظر سے ملت کے مفسد کا جائزہ لیا۔ چنانچہ اس دور کے حالات انہوں نے خود ہی بالوضاحت بیان کر دیئے ہیں۔ علماء کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔

"ثمضوا لطلب العلم توصلوا الى العز والجاه فاصبح الفقهاء"

(بقیہ صفحہ گذشتہ) گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ حضرت مجددی نے عقل و نقل سے اس نظریہ کو غلط ثابت کیا۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے وحدت الوجود کے مقابلہ میں "وحدت الشہود" کا تصور پیش کیا، لیکن یہ غلط ہے۔ دراصل ان کے نزدیک وحدت وجود سناٹک کے مراحل سلوک کا ابتدائی مرحلہ ہے جبکہ وہ حقیقت الامر کے حالات کائنات کو عین خدا تصور کرنے لگتا ہے۔ اور اسکے بعد بتدریج وہ اس مقام سے مکمل جاتا ہے اور آخر میں اصل حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے کہ کائنات کا وجود، وجود باری کا عین نہیں بلکہ غیر ہے، لہذا وحدت وجود کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے بلکہ یہ محض کشفی و شہودی تصور ہے۔ اور اسی کو وحدت الشہود سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ۱۲

بعد ما كانوا مطلوبين طالبين وبعد ان كانوا اعزاً

بالاعراض عن السلاطين اذلةً بالاقبال عليهم -

یہ لوگ عزت اور جاہ تک پہنچنے کے لئے حصول علم پر آمادہ ہوئے ہیں۔

پس فقہا جو اس سے پہلے لوگوں کے مطلوب تھے، اب طالب ہو گئے ہیں

سلاطین سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے پہلے وہ باعزت تھے اور اب

سلاطین کے درباری بننے سے ذلیل ہو گئے ہیں۔

صوفیا کی نسبت لکھتے ہیں -

در کرامت فروشان این زمان ہمہ الاماشار اللہ طاسمات و

نیرنجات را کرامات دانستہ اند - (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ)

اس زمانہ کے کرامت فروش لوگ باسنتنا مشیت الہی، طلسموں

اور علم نیرنج کو کرامت تصور کرتے ہیں۔

اسی طرح آپ نے ملوک و سلاطین، امراء و شرقاء، صنایع و تجار

اہل فوج، مشائخ زادوں، اور دوسرے طبقوں کو الگ الگ خطاب

کیا ہے۔ اور ان کے اعمال و اشتغال پر نہایت شدید اور مدلل نکتہ چینی

کی ہے۔ اور ملت کے مفاسد عامہ سے بھی مفصل بحث کی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ شاہ صاحب کا زمانہ نہایت پر آشوب اور پر فتن

تھا۔ اور خود شاہ صاحب کو یقین تھا کہ ملت اسلام یہ تسفل و ادبار کی

جس منزل پر پہنچ چکی ہے۔ اب اسکا بچ نکلنا بہت مشکل ہے۔ اور وہ

قدرت کے اس اہل فیصلہ کے منتظر تھے جو ایسی بد کردار قوموں کے لئے

مقدر ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب کی دور میں نگاہ اپنے وقت میں آنے والے
انقلاب (فک کل نظام) کا تاثر کا رہی تھی۔ اور اہل زمانہ کی بدکرداریوں
کے انجام کی طرف انہوں نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

کانت بخوصاً ومضت فی العیاب عیون الافاعی اور دوس العقار

جو ستارے تاریکیوں میں چمک رہے ہیں (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) وہ سانپوں کی
آنکھیں یا بچھڑوں کے سر ہیں۔

بہر حال قدرت کا جو فیصلہ تھا وہ ٹل نہ سکتا تھا۔ اور یہ شاہ صاحب کے
بس کی بات نہ تھی کہ وہ آنے والے عذاب الہی کا رخ پلٹ دیتے۔ ان سے
انتاہی ہو سکتا تھا کہ وہ آنے والی نسلوں کے لئے راہِ عمل متعین کر جائیں
اور اس کام میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب نے
کتاب و سنت کی بنیادوں پر فلسفہ حیات ترتیب دیا۔ اور مسلمانوں کی اصلاح
و تعمیر اور کامل دینی انقلاب بپا کرنے کا طریق کار تجویز کیا۔ (نور اللہ مرقدہ
وجبل النجۃ مشواہ۔)

اس ضمن میں دنیا کے مشہور مفکر علامہ اقبال کے علمی اور تعمیری
کارنامہ سے انعام کرنا بھاری اظلم ہوگا۔ بالخصوص جبکہ ان کی کوششیں
ہمارے ہی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور عصر حاضر کے جدید مسائل میں
ہم ان کے افکار و خیالات سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس
سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم حضرت علامہ کو مجدد مانتے ہیں۔ کیونکہ شانِ
کے لئے جس محیر العقول کردار اور روح تقویٰ و جہاد کی ضرورت ہے۔

علامہ موصوف میں بہت کم ملتی ہے۔ اور وہ خود بھی اس بات کے معترف تھے۔ ہم ان کو عصر حاضر کا ایک فقید المثال اور بلند پایہ اسلامی مفکر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کی راتیں رومی کے سوز و ساز اور رازی کے بیچ و تاب میں بسر ہوئیں اور انہوں نے جو کچھ سوچا وہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن فلسفہ جہاد و عمل کو انہوں نے نہ اپنے اوپر طاری کرنے کی زیادہ کوشش کی اور نہ ان کے ماننے والوں میں یہ چیز پیدا ہو سکی۔ مگر ان کی علمی اور تعمیری خدمات کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ علامہ مرحوم کی یہ خدمت ہی کیا کم ہے کہ جب مغربی دہریہ و الحاد کا سیلاب ملت کی نئی پود کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا تو اس مرد مومن کے وجد آفریں دل نواز اور پُراز حقیقت کلام نے دلوں میں از سر نو اسلام کی عظمت کو تازہ کیا اور زیادہ نہیں تو اسلام کے نام سے ان لوگوں کو گہری عقیدت پیدا ہو گئی۔ اب مسلمانوں میں تقویٰ و مہارت، پاکیزہ سیرت اور اعلیٰ کردار اور روح جہاد پیدا کرنے کا کام باقی ہے۔ اور اگر رب العزت کو اس قوم کی حقیقی اصلاح منظور ہے تو اس کام کے لئے وہ کسی دوسری شخصیت کو پیدا کر دیکھا جائے۔ علم و نظر اور عمل و کردار سے معاشرہ میں کامل دینی انقلاب پیدا کرنے میں کامیاب ہوگی۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

علامہ مرحوم کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو ایک ہمہ گیر انسانی، عالمی اور لازماً ناقص حیات کی حیثیت سے متعارف

کرایا۔ اور عصر حاضر کے تصور قومیت (نیشنلزم) کی تباہ کاریوں سے دنیا کو آگاہ کیا۔

تفریقِ ملل ملت افزنگ کا مقصود اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
 مکہ نے دیا خاکِ جلتو اگو یہ پیغام جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم
 حضرت اقبال دینی انقلاب اور خلافتِ الہیہ کے سرگرم داعی تھے
 مگر اسلئے نہیں کہ وہ خود مسلمان تھے۔ بلکہ اسلئے کہ ان کے نزدیک انسانیت
 کی حقیقی فلاح و نجات اسکے سوا ممکن ہی نہیں ہے۔ اور نسلی آدم کی ہمہ گیر
 تباہی کا سبب یہ ہے کہ دولت اور دین کو جدا جدا کر دیا گیا ہے۔

ہوئی دولت و دین میں جسمِ جدائی ہوس کی امیری ہوس کی فقیری
 دونی ملک و دین کے لئے نامرادی دونی چشم تہذیب کی نابصری
 یہ اعجاز ہے ایک عمر انشیں کا بشیری ہے آئینہ دار ندیری
 اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہوں ایک جنیدی وارد شیری
 حضرت اقبالؒ نے اسلامی تصور حکومت کو اپنی قلم حکومتِ الہیہ
 میں خوب واضح کیا ہے۔

بندہ حق بے نیاز از ہر مقام نے غلام اور اتہ او کس را غلام
 بندہ حق مرد آزاد است و بس ملک و آئینش خدا داد است و بس
 رسم و راہ و دین و آئینش از حق زشت و خوب و تلخ و نوشینش زہق
 عقل خود میں غافل از بہبود غیر سو و خود بیند نہ بیند سو و غیر
 وحی حق بیندہ سو و ہمہ درنگامش سو و وہی بود ہمہ

مذکورہ علمی اور تعمیری کوششوں کی عمومی نظر اس طرز کی کوششوں

ہے وہ یہ ہے کہ ان ارباب اصلاح و تجدید کے سامنے یا تو یہ مقصد ہی نہ تھا کہ حکومت و سیاست کا وہ نظام جو سراپا لادینی تقورات پر مبنی تھا یکسر بدل دیا جائے۔ اور خلافت راشدہ کے طریق پر صحیح اسلامی اصول سیاست کے مطابق جدید دینی حکومت کی تشکیل کی جائے اور یا زمانہ کے مخصوص حالات کے پیش نظر ان کو مکمل دینی انقلاب بپا کرنے کے مواقع ہی نہیں حاصل ہو سکے۔ جس کی وجہ سے ان کی کوششیں بیرونی اسباب فساد کے ازالہ و دفاع کے لئے وقف ہو کے رہ گئیں۔ اور اصل سرچشمہ فساد کی طرف وہ توجہ نہ دیکے۔

تاہم ان ائمہ اصلاح و تجدید کے تجدیدی کارناموں کی نسبت یہ خیال کرنا غلط ہے کہ وہ صرف دور ماضی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جو دور میں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اور ہمارے مذہبی اور غیر مذہبی طبقے جن گونا گوں اجتماعی امراض و مفاسد میں مبتلا ہیں ان کی نوعیت بڑی حد تک دور ماضی کے اجتماعی اور ملی مفاسد و اسقام سے ملتی جلتی ہے۔ اور ان حضرات کے علمی اصلاحی اور تعمیری کارناموں سے آج بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے انکی یہ علمی کاوشیں وقتی اور محدود نہیں ہیں۔ بلکہ مستقل اور پائیدار حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آج زندگی کے جوئے

نئے مسائل ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ ان کو حل کرنے کے لئے صرف ماضی کی ان کوششوں پر ہی قناعت کر لی جائے۔ اور اجتہاد و فکر سے کام نہ لیا جائے۔ دراصل اپنے زمانہ سے تعلق رکھنے والی کوشش خواہ کتنی ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔ مگر وہ ہر زمانہ کے مقتضیات سے عہدہ بردار نہیں ہو سکتی۔

اس لئے آج جدید حالات و مسائل کے پیش نظر اہل علم کی جدید نبضت علمیہ کی ضرورت ہے جس میں ماضی کے علمی کارناموں کو اتنا ہی دخل ہو جتنا اس زمانہ میں کارآمد ہو سکے۔

ہم آگے چل کر ان علمی کارناموں کے ان پہلوؤں کو منظر عام پر لائینگے جن سے ہم اپنی تعمیر جدید میں استفادہ کر سکتے ہیں۔

مستقبل کی تعمیر کا نقشہ کا

مانعی اور حال کے اجتماعی مفاسد کے پیش نظر اور اصلاح و تعمیر کے قرآنی اصول و مبادی کی روشنی میں آج ملت کی تعمیر کا کام کس ڈھنگ سے شروع کیا جائے۔ اور عنصرِ رواں کے جدید تقاضوں کے پیش نظر اس کا طریق کار کیا ہو؟ یہ مسئلہ اپنی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے بہت زیادہ التفات و توجہ کا مستحق ہے۔

یہ بات حقیقتِ ثابتہ کا درجہ رکھتی ہے کہ آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ فکری اور ذہنی انتشار کا سخت ہیجانی دور ہے۔ ملائیت و صوفیتا پیلے سے شدید تر شکل میں معاشرہ کو ذہنی انحطاط کی طرف لے جا رہی ہے۔ ملوکیت و آمریت نے آج مغربی جمہوریت کی نقاب اوڑھ رکھی ہے۔ مغربِ نزدیکہ طبقے مغربی علوم و افکار اور جدید سیاسی و معاشی تصورات سے متاثر ہیں اور "جاہلیتِ حدیثہ" نے ان کے قلب و دماغ میں اپنے نیچے گار رکھے ہیں۔ اور عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ مذہبی طور پر ملا و صوفی کے زیر اثر ہیں اور سیاسی طور پر اہل جاہلیتِ حدیثہ کے آڑے کار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں کوئی ایسی اصولی تحریک اٹھانا جس کا مقصد موجودہ ذہنی

انتشار و طوائف الملوکی کو ختم کرنا، اور خالص دینی بنیادوں پر معاشرہ میں فکری اور اعتقادی وحدت پیدا کرنا ہو، محنت دشوار ہے مگر جس کام سے انسانیت عامہ کی حقیقی فلاح و نجات وابستہ ہو۔ خود غرض طبقوں کی پیدا کردہ مشکلات کی وجہ سے اسکو چھوڑا نہیں جاسکتا۔ بلکہ حقیقت میں اگر کوئی کام کرنے کا ہے تو وہ صرف یہی کام ہے۔ اور اسکے سوا جو کچھ ہے وہ ہوائے نفس کی پرستش ہے۔

اگر بایں نہ رسیدی تمام بوبیست

مگر اس کام کی ابتدا کرنے اور پھر اسکو کامیابی کی منزل تک لے جانے کے ایمان و تقویٰ غیر متزلزل عزم و یقین، دور رس نگاہ، بے پناہ جوش و کراہ، ہمت بلند اور ایسی قوتِ عمل کی حاجت ہے جس سے جاہلیتِ جدیدہ کی "سد سکندری" پاش پاش ہو کے رہ جائے۔

ضرب قلندری بیار سد سکندری شکن

رسیم کلیم تازہ کن رونق سامری شکن

کام شروع کرنے کے لئے یقیناً ایسے مردانِ کار کی ضرورت ہے جو ایمان و عمل تقویٰ، صلاح اور عزم و یقین کی متاعِ گراں مایہ اپنے ساتھ رکھتے ہوں۔ اور جو لوگ متاعِ یقین و عمل سے محروم ہیں۔ وہ اس قافلہ اہل عزیمت کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ لہذا کام کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو قوم کے ہر گروہ اور ہر طبقہ سے جن جن کو سامنے لایا جائے اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں ایسے اصحابِ علم و عمل کی قلت ہے مگر یہ

غلط ہے کہ ایسے لوگ اس قوم میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ یقیناً یہ قوم اس درجہ عقیم نہیں ہے۔ اور اسکی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا جو مردانہ کار اور ارباب عزیمت سے تہی دامن ہو۔

گماں مبرکہ بہ پایاں رسید کارمغاں

ہنوز بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

ان صالح اور باعمل افراد قوم کی تنظیم کا مرحلہ بھی بڑا اہم اور کٹھن ہے

اس میں پیغمبرانہ دعوت انقلاب کے اصول و مبادی کی رعایت کرنا اور ان غلطیوں سے بچ کر چلنا جن کی وجہ سے ماضی کی انقلابی تحریکیں ناکام رہی ہیں از بس ضروری ہے۔

ماضی قریب میں حصول آزادی کے لئے جن جماعتوں نے جدوجہد کی ہے۔ انکی ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ ان میں تطہیر و تعمیر فکر کی طرف مطلق توجہ نہیں دی گئی۔ بے حقیقت نعروں اور بے مغز ہنگاموں سے دلوں میں ارتعاش پیدا کیا گیا۔ اور اسکے نتیجہ میں آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر طرف اضطراب و بے چینی کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ فسق و معصیت کا طوفان بپا ہے۔ ذہنی، اخلاقی، اقتصادی اور معاشی حالت پہلے سے زیادہ ناہموار ہو رہی ہے۔ اور دلوں کا سکون بالکل رخصت ہو چکا ہے۔ اسکی وجہ بجز اسکے اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ تنظیمیں جن اصول و تصورات کی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھیں، ان کا فطری اور طبعی نتیجہ ہی ہو سکتا تھا، جو آج ہمارے سامنے ہے۔ زمین میں جھاڑ کا درخت لگا کر آپ کیسے

توقع رکھ سکتے ہیں کہ یہ آم کا پھل لائیکا۔ کانٹوں کی فصل بوکر آپ پھولوں
کی بہار کا تماشائیے دیکھ سکتے ہیں۔ گندے نالوں میں ناکارہ اور نہایت
گھٹیا قسم کی گھاس پھوس ہی اگ سکتی ہے۔ جس سے مخلوق خدا کو بچاتے
قائدہ کے نقصان ہی پہنچتا ہے۔

البلد الطیب ینرج نباتہ
یاذن ربہ والذی خبث
لا ینرج الا نکدا۔
پاکیزہ زمین سے خدا کے حکم سے سبزہ
اگتا ہے۔ اور جو ناپاک زمین ہے اس سے
بجز ناقص اور ناکارہ چیزوں کے اور کیا
اگ سکتا ہے؟ (الاعراف)

اگر جماعتی تنظیم کو صحیح اور صالح اصول و تصورات کی اساس پر کھڑا
کیا جاتا تو راج و من و خوش حالی، سکون قلب، معاشی توازن، جذبہ اخوت
اور مساوات عامہ کی ضیاء باریوں سے زمین کا چپہ چمک اٹھتا۔ نغمہ ہامست
سے نضا گونج اٹھتی اور ہر شخص آزادی و حریت کے ثمرات سے متمتع ہوتا
کیونکہ ان اصولوں کا طبعی نتیجہ ہی یہ ہے۔

پاکیزہ کلمہ کی مثال اس پاکیزہ درخت کی
سی ہے جسکی جڑیں زمین میں مضبوطی سے
گڑی ہوئی ہوں اور شاخیں بلندی میں
لہرا رہی ہوں اور وہ اپنے رب کے حکم سے ہر
موسم میں پھل لاتا ہو۔
مَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ
أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ
تُؤْتِي أُكْلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا
(ابراہیم)

ان حقائق کے پیش نظر مستقبل کی تعمیر معاشرہ میں ذہنی انقلاب پیدا

کرنے اور نظام اسلامی کی عملی تشکیل کا کام صرف اسی جماعت کے ذریعہ سے تکمیل پذیر ہو سکتا ہے جو قرآن حکیم کے اخلاقی تصورات کی بنیادوں پر منظم ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ آج کے جدید حالات میں تعمیری کام کی نوعیت | کام کی نوعیت کیا ہوگی؟

سطور بالا میں قوم کا ذہنی اور فکری حیثیت سے تجزیہ کیا جا چکا ہے ان طبقوں کی اصلاح و تعمیر کے لئے آج ایسے تعمیری لائحہ عمل کی ضرورت ہے جو ہر حیثیت سے جامع و مکمل ہو۔ یعنی آج کی دنیا میں جاہلیت قدیمہ اور جاہلیت حدیثہ نے اسلام کے خلاف جتنے محاذ بنا رکھے ہیں۔ صالحین کی اس جماعت کو ان تمام محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔ جہاں پرانے ہتھیاروں کی ضرورت ہے، وہاں پرانے ہتھیاروں کو کام میں لایا جائیگا۔ اور جہاں جدید اسلحہ کی ضرورت ہے، وہاں جدید اسلحہ استعمال کئے جائینگے لیکن اگر اس بات کی کوشش کی جائے کہ آج سے آٹھ سو سال پہلے کے پرانے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر نہ مانہ حال کے جدید آلات حرب کا مقابلہ کیا جائے تو یہ کوشش یقیناً ناکام رہے گی۔ مثلاً دور عباسیہ میں قتلۂ اعترال کے خلاف جو علمی اور استدلالی جدوجہد کی گئی تھی وہ اس زمانہ کے لحاظ سے یقیناً کامیاب کوشش تھی۔ لیکن آج جدید اعترال کے مقابلہ میں نئی حرکت علمیہ کی ضرورت ہے۔ جو کتاب و سنت کے اصول موضوعہ اور قوانین کلیہ سے ماخوذ ہو۔ مگر اس کا مطلب نہیں ہے کہ ہم آج ماضی کی

علمی، اصلاحی، اور تعمیری کوششوں سے بالکل بے نیاز ہو جائیں۔
 اور اپنی قومی وطنی۔ وایات کو یکسر نظر انداز کر دیں۔ قوم کی اجتماعی زندگی
 کے تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کہ عصر
 حاضر کے جدید تقاضوں اور نئے تغیرات کے ساتھ ساتھ زندگی کو تبدیل
 کرنا ناگزیر ہے۔ یہ دونوں کام اپنی اپنی حدود میں بالکل درست ہیں لیکن
 ان میں سے کسی ایک کو اگر حد اعتدال سے بڑھا دیا جائے تو اس سے پیشاب
 قومی وطنی مفاسد رونما ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر قومی سیرت اور اجتماعی زندگی
 کے بنیادی اور اصولی تسلسل کو منقطع کر دیا جائے تو یہ قوم اپنے تشخص ملی
 سے محروم ہو جائیگی۔ اور پھر ہر قوم اسکو آسانی سے اپنے اندر جذب کر سکے گی۔
 اور اگر جدت آفرینی اور سعی اجتہاد سے بالکل پہلو تہی کر لیا جائے اسلاف
 کے کارناموں کو غیر متغیر اور غیر متبدل سمجھ کر محض ان پر ہی قناعت کر لی
 جائے۔ اور زمانہ کی نئی ضرورتوں کے مطابق اپنے اندر نیا تغیر پیدا کرنے
 کو گناہ تصور کر لیا جائے تو قوم ایک لاشہ بے جان یا قشر بے مغز بن
 کے رہ جائے گی جس کو زمانہ کا سیلاب خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائیگا۔
 کیونکہ جو قوم وقت کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکتی ہو، قدرت اسکو
 ”بقا اصلح“ یا ”بقا انفع“ کے ہمہ گیر اصول کے تحت ہرگز زندہ رہنے کا
 حق نہیں دیتی۔ زمانہ ہر چیز سے حسن و مورد نیت اور قوت و استحکام
 کا مطالبہ کرتا ہے۔ جو اسکے مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے مستعد رہتا ہے
 اسکو وہ بہار زندگی سے ہمکنار کرتا ہے اور جو اسکے مطالبہ سے پہلو تہی

کرتا ہے۔ اسکو وہ آنکوش عدم میں سلا دیتا ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ
اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ
زَبَدًا رَّابِيًا۔ وَهِيَ اَيُّ قَدْوَنَ
عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءً حِلْيَةً
اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ يَجْرِبُ
اللّٰهُ الْحَقُّ وَالْبَاطِلُ اِنَّمَا النَّزِيْدُ
فِيْ ذٰلِكَ هَبَّ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ
النَّاسَ فَيَمْكُتُ فِي الْاَرْضِ۔
كَذٰلِكَ يَجْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ۔
(الرعد)

خدا نے آسمان سے پانی اتارا پس اپنے اپنے
اندازہ سے نالے بہنے لگے۔ پس سیلاب نے
ابھرے ہوئے جھاگ اکٹھا لئے۔ اور اس چیز
جسکو دکھائی میں رکھ کر، آگ پر زبور
بنانے کے لئے جلاتے ہیں، سے بھی ایسے ہی
جھاگ اُٹتے ہیں، اللہ تعالیٰ حق و باطل کی
اس طرح مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ
خشک ہو کر ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور جو چیز
لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے۔ وہ زمین میں
باقی رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی ہی مثالیں

بیان کرتا ہے۔

بہر حال تعمیری جدوجہد کی راہ میں جدید علمی کاوشوں کے ساتھ ساتھ
ماضی کے علمی اور تعمیری کارناموں سے بھی استفادہ کرنا پڑے گا۔ مثلاً
زمانہ حال کے غلط کار اہل خانقاہ اور اہل مدرسہ جو ہر اصلاحی کوشش کے
دشمن اور ہر تعمیری جدوجہد کی راہ میں شدید رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ ان
مرض کی نوعیت آج بھی قریب قریب وہی ہے جو آج سے کئی صدی پہلے تھی
علیٰ ہذا، عامۃ المسلمین کے معاشرتی، اخلاقی، تمدنی اور اجتماعی مفاسد ایک
حد تک دور ماضی سے ملتے جلتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی اصلاح کے لئے آج بھی

علامہ ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی اور امام ولی اللہ کے علمی اور تعمیری کارناموں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اول الذکر طبقوں کی اصلاح کے توسط سے اور براہ راست عوام میں اخلاقی اثر و نفوذ پیدا کرنے سے یہ جدید جماعتی تنظیم ایک موثر طاقت بن سکتی ہے۔

مغرب کی نشاۃ جدیدہ نے سیاست و معیشت کے نئے نئے فطرت (تھیوریز) پیدا کر دیئے ہیں۔ اور قوم کا ایک بڑا طبقہ ان جدید تصورات سیاست و معیشت سے شدید طور پر متاثر ہے۔ اور ذورِ حاضر میں جو جماعت اخلاقی بنیادوں پر معاشرہ میں جدید انقلاب برپا کرنے کے لئے کھڑی ہو سکو بہر حال کتاب و سنت کے اصول عامہ کی روشنی میں ان مسائل کا سائنٹیفک حل تلاش کرنا پڑے گا۔ یہی وہ اہم کام ہے جس سے جاہلیت جدیدہ کے جارحانہ اقدام کو روکا جاسکتا ہے۔ اور جو لوگ اسکے ذریعہ ہیں، ان کو قریب لایا جاسکتا ہے۔

اس کام میں اگرچہ جدید علمی کاوش کی ضرورت ہے۔ مگر ماضی کے علماء و مفکرین کے افکار و خیالات سے استفادہ کئے بغیر جارحانہ کار نہیں ہے۔ مثلاً اجتماعی سیاسیات و معاشیات کے موضوع پر ابن عبید کی کتاب الاموال، قاضی ماوردی کی الاحکام السلطانیہ، ابن تیم کی طرق الحکمہ و اعلام الموقعین، امام ابو یوسف کی کتاب الخراج، شاہ ولی اللہ کا فلسفہ سیاست و معیشت، اور علامہ اقبال کا فلسفہ تمدن بڑی حد تک ہماری جدید حرکت علمی میں معاون بن سکتا ہے۔

اس موقع پر ایک دوسری حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ اصولی جماعت جس نے پوری قوم کو زندگی کے مقدس اور بلند تر نصب العین سے روشناس کرنا اور پھر اس میں اس نصب العین کے لئے سچی تڑپ اور گہری لگن پیدا کرنا ہے۔ اسکو ہر طرح کی سیاسی طبقاتی اور گروہی عصبیت سے بالاتر ہونا چاہئے تاکہ وہ ہر طبقہ کے لوگوں میں اپنا کام جاری رکھ سکے۔ اسکے برعکس اگر وہ موجودہ عملی سیاست میں حصہ لیکر یا کسی خاص مذہبی طبقہ سے اپنے کو منسوب کرے گی تو وہ دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح ایک سیاسی پارٹی یا دوسرے مذہبی گروہوں کی طرح ایک مذہبی گروہ بن کے رہ جائیگی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسکی دعوت بالکل بے اثر اور محدود ہو جائیگی۔ لہذا اس جماعت کو اپنے اعلیٰ مقصد کی خاطر فروعی اور وقتی مسائل میں الجھنا نہیں چاہئے۔ اور اس کا حقیقی کام صرف اتنا ہے کہ وہ معاشرہ کے دل و دماغ میں اتر جائے اور اسکے فکر و ذہن کو تبدیل کر کے رائے عامہ کو ہموار بنا دے۔ یہ کام یقیناً وقت اور محنت کا طالب ہے۔ لیکن اس میں جتنا عرصہ اور جتنی محنت صرف ہوگی۔ نتائج بھی اتنے ہی شاندار ہوں گے۔ یعنی اس مقدس جدوجہد کے نقوش قوم کی حیات اجتماعیہ میں جس قدر گہرے ہوتے جائیں گے، اتنا ہی سیاسی و معاشی انقلاب کا وقت قریب تر ہوتا جائیگا۔ اور جاہلی اقتدار کی گرفت ڈھیلی ہوتی جائیگی۔ اور بالآخر بغیر کسی شدید مزاحمت کے کامل سیاسی انقلاب بپا کیا جاسکے گا۔

سطور بالا میں قوم کے جن طبقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی وسائل کا راز ذہنی تربیت الگ الگ ماحول میں ہونی ہے۔ اور اس وجہ سے انکی زندگی کے نقطہ ہائے نظر بھی جدا جدا ہیں۔ مشائخ و صوفیا کی جماعت کے افکار و تصورات کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ انکی دنیا ہی دوسرے لوگوں سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ تسبیح خوانی اور ذکر و مراقبہ کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ اور جو لوگ انکی طرح عورت گیتی کی زندگی بسر نہیں کرتے وہ انکی نظر میں دنیا پرست اور مردار خور ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ انکی معیشت کا دار و مدار ان مردار خوروں ہی کے نذرانوں پر ہے۔ اور اس سے ہم یہ بات سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ ان لوگوں نے زندگی کی بلاخیز کشاکش سے تنگ و کرگوشہ نشینی کی راہ اختیار کی ہے۔

زابد نہ داشت تاب جمالِ پری رخاں

کنجے گرفت یاو خدا را بہا نہ ساخت

علمائے مدرسہ کی فضا میں پرورش پائی ہے۔ زندگی کے نئے تقاضوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ آج سے کئی سو سال پہلے کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ان کا رجحان فکر دوسرے طبقوں سے بالکل ہی نرالا ہے۔ اور بحث و مناظرہ اور قیل و قال ان کی زندگی کا معمول ہے۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی ساخت میں لادینی علوم و افکار کا عنصر غالب ہے۔ اور اسلام کے ساتھ بھی ان کا رسمی تعلق قائم ہے اس دوگونہ تعلق نے ان کے ذہن کو عجیب و غریب مجموعہ اضداد بنا دیا ہے۔

یہ لوگ جب کسی مسئلے پر سوچنے لگتے ہیں تو ان کی حرکتِ فکر کی ابتدا اہل مغرب کے مادی افکار و تصورات سے ہوتی ہے۔ اور آگے چل کر جب ان کو اپنے مسلمان ہونے کا احساس دامن گیر ہوتا ہے۔ تو کسی سنی سنائی آیت کو توڑ مڑ کر اپنے خیال کی تائید میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ ذہنی تضاد حد درجہ مضحکہ خیز اور ملت اسلامیہ کی وحدتِ فکر کے لئے زہر قاتل ہے۔

عامۃ المسلمین ہمیشہ سے اہل اقتدار اور علما و مشائخ کے زیر اثر رہے ہیں۔ اور آج بھی ان کا یہی حال ہے۔ یہ لوگ خود دینی اور ملی شعور سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اور چالاکان کو بھیڑ بکر یوں کے ریورڈ کی طرح آگے لگا لیتے ہیں۔ مگر ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، وہ عوام کی پریشانی خیال اور انتشارِ ذہن کا بحرانی دور ہے۔ ماضی اور حال کی اجتماعی تحریکوں نے ان میں مایوسی کی لہر دوڑا دی ہے۔ اور سیاسی جماعتوں کے بے حقیقت دعاوی، غرض پرستانہ عزائم اور مکارانہ طرز سیاست سے یہ لوگ اس قدر بدظن ہو چکے ہیں کہ اب وہ کسی منخلص اور صالح جماعت پر بھی مشکل ہی سے اعتماد کر سکتے ہیں۔

ان چار طبقوں میں سے ہر ایک طبقہ بلیسیوں گروہوں میں منقسم ہے اور ہر گروہ کا اندازِ فکر دوسروں سے بالکل ہی جدا ہے۔ مگر اتنی بات سب میں مشترک ہے کہ ان کی ذہنی تربیت صحیح دینی تصورات کی بنیادوں پر نہیں ہوئی۔ اور غیر اسلامی افکار و تصورات ان کے دل و دماغ میں اس طرح

را منسوخ ہو چکے ہیں کہ اب ان میں خالص دینی تحریک کی مقبولیت مشکل ہے
یہ صحیح ہے کہ ہر گروہ میں کچھ پاکیزہ فطرت اور مستعد لوگ موجود ہیں جو
دینی دعوت کو بخوشی قبول کریں گے۔ مگر بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن
فطرت سلیمہ منسوخ ہو چکی ہے۔ اور وہ نہ صرف اس دعوت سے اعراض کر
بلکہ اپنے شخصی قبیلوں اور جماعتی مفاد کی خاطر اس کی مخالفت میں
تمام قوتیں رٹا دینگے۔

ان حالات میں دینی دعوت کا انحصار بڑی حد تک قوم کی نئی
کی ذہنی تربیت پر ہے۔ اور درحقیقت موجودہ فکری لامرکزیت،
مقصدی انتشار کو ختم کرنے کا اسکے سوا کوئی طریق کار نہیں ہے۔ اس
وہ اہم کام ہے جس پر سب سے زیادہ توجہ صرف کرنا پڑے گی۔ مگر یہ
ہے کہ یہ کام جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ یعنی اس مقصد کی
کئی منزلیں ہیں۔ اور ہر منزل بجائے خود ایک نہایت شدید اور
جس کو سر کرنے میں تمام علمی اور عملی قوتوں کو حرکت میں لانا پڑے گا۔
اس بات کو کسی حال میں بھولنا نہیں چاہئے کہ جب تک زندگی
اور مستقل اقدار کے زیر اثر انسانی ذہن کی از سر نو تعمیر نہ ہوگی۔
ہمہ گیر ذہنی لامرکزیت اور فکری پراگندگی کو ختم کرنے کے بعد فکر و
رابطہ و نظم پیدا نہ ہوگا، اس وقت تک انسانی کوشش کسی
مسئلہ زندگی کو بھی حل کرنے میں کامیاب نہ ہوگی۔ اس لئے سب سے
کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ ذہنی انتشار کو ختم کر کے فکر و خیال

و تسلسل پیدا کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کی پہلی منزل یہ ہے کہ ایک جدید مکتب فکر (سکول آف تھاٹ) کی طرح ڈالی جائے۔ یہ مکتب خیال خدا پرستی کے تصور اور خیر و شر کی حقیقی قدروں کی اساس پر جدید اسلامی فلسفہ زندگی کی تشکیل کرے۔ اسلامی عقائد و اعمال کی سائنٹیفک توجیہات سے ایک مربوط اور منظم نظام فکر ترتیب دے۔ یعنی اسلام کی حقیقی روح اور دین کے اصل منشا کو سمجھنے کے بعد الہیات، طبعیات، سیاست و معیشت اور عبادات و معاملات کے قرآنی تصورات کی اس رنگ میں توجیہ کی جائے کہ عصر حاضر کے عقل پرست انسان کو (بشرطیکہ وہ دنیا و سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ ہو) قرآنی فلسفہ زندگی کی ہمہ گیر افادیت کا یقین ہو جائے۔ اور وہ خود ہی محسوس کرنے لگے کہ دنیا میں امن و سلامتی ہم کی راہ صرف اسلام ہی کی راہ ہے۔ اور پھر ان تصورات کو اس طرح مرتب اور منظم شکل میں پیش کیا جائے کہ ہر تصور اپنے صحیح مقام پر فٹ آ جائے۔ ابھی اور ابتدا سے انتہا تک اسلام کی حقیقی روح اس میں جاری و ساری ہو۔

میں یہ کام اتنا مشکل ہے کہ موجودہ حالات میں اسکے تصور ہی سے دل میں پروہشت طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن ہر ایسے کام کی ابتدا ہمیشہ نامساعد ہو کام در مایوس کن حالات میں ہوتی ہے۔ اور جب عزم صحیح کے ساتھ کام کا آغاز ہو جاتا ہے تو تدریجاً یا اس و نو میدی کے بادل چھٹتے چلے جاتے ہیں۔ اور ذوق مایابی کی غالمتاب شفاعتیں ضیا بار ہونے لگتی ہیں۔ اور پھر پہلی منزل

ہی کام کے تمام تکمیلی مراحل طے نہیں ہو جایا کرتے بلکہ ابتدائی مرحلہ پر اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ نئے کام کی ایک مثال قائم کر دی جائے۔ اسکے بعد ذہنی نقشہ کے مطابق یہ فقرہ مکر رہے اس جدید علمی حرکت کو جاری رکھا جائے۔ اور اس نقشہ میں جو خانے خالی رہ گئے ہوں انکو تدریجاً پُر کرنے کی سعی کی جائے۔

کام کی دوسری منزل یہ ہے کہ اس نظام فکر کی بنیادوں پر ایک تفصیلی نصاب تعلیم مرتب کیا جائے۔ جس کے تمام شعبے بنیادی فکر اور غایت و مقصد کے لحاظ سے باہم مربوط ہوں۔ اس نظام تعلیم کی ترتیب میں اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ اسکی ہر کڑی اپنی صحیح جگہ پر جڑی ہوئی ہو۔ اور وہ اپنی طبعی ساخت و ترکیب سے انسانی فکر میں ربط و نظم پیدا کر سکتا ہو۔ آج ممالک اسلامیہ میں دو قسم کے تعلیمی مراکز پائے جاتے ہیں۔ دینی درسگاہیں۔ اور جدید علوم کے کالج اور یونیورسٹیاں۔ اول الذکر درسگاہوں میں جو نظام تعلیم رائج ہے۔ وہ آج سے آٹھ سو سال پہلے کے علماء و مجتہدین کے علمی کارناموں پر مشتمل ہے، یہ کارنامے اُس دور کے لئے یقیناً موزوں اور کارآمد ہونگے۔ لیکن آج علمی دنیا میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ اور بے شمار علمی، معاشی، سیاسی اور عمرانی مسائل ہیں جو قرآنی بصیرت اور مجتہدانہ نظر کے بغیر ہرگز حل نہیں ہو سکتے۔ مگر ہمارے علماء و مفسرین اور علماء کی حالت یہ ہے کہ ان کے نزدیک کئی صدی پہلے کے مفسرین اور علماء مفکرین کے اقوال و افکار کو ازبر کر لینا ہی منہا ہے کمال ہے۔ اور

میں خود غور و فکر کرنا ان کے نزدیک گناہِ عظیم بلکہ کفر ہے۔ نیز مردِ جوہِ دینی نظامِ تعلیم کسی مربوط نظامِ فکر اور متعین مقصد پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ چند بے جوڑ اور بے ربط علوم و فنون پر مشتمل ہے۔ جس سے قدرتی طور پر ذہن میں ربط و نظم نہیں پیدا ہوتا، بلکہ اور زیادہ الجھاؤ پیدا کرتا ہے۔

یہ تو دینی درسگاہوں کی حالت ہے۔ اور دنیوی درسگاہ کا بنیادی مقصد ہی ایسے لوگ پیدا کرنا ہے جو حکومت کی مشینری میں پرزوں کا کام دے سکیں۔ ظاہر ہے کہ جس نظامِ تعلیم کی غرض و غایت ہی محض پیٹ پوجا ہو اس سے فکر و ذہن کی اصلاح و تنظیم کی توقع رکھنا سراسر غلط ہے۔ اس بنا پر آج ضرورت ہے کہ آئندہ نسلیں کے لئے جو جدید نظامِ تعلیم مرتب کیا جائے، وہ دین کے بنیادی تصور اور مقصد حیات کے اعتبار سے اس طرح مربوط ہو کہ اسکے بڑھتے والوں میں ابتدا ہی سے مقصد کا شعور پیدا ہونے لگے۔ اور جوں جوں وہ آگے بڑھتے جائیں اسی قدر یہ مقصدی شعور تیز تر ہوتا جائے۔ کتاب و سنت۔ فلسفہ طبیعی، اور مابعد الطبیعی، علم قانون، علم الاخلاق، علم العمران اور دیگر تمام علوم و فنون میں ایک ہی روح کا فرما ہو۔ نیز یہ نصابِ تعلیم ہر لحاظ سے ہمگیر اور مکمل ہو اور اس میں دینی اور دنیوی کی کوئی تفریق نہ ہو۔

یہ کام بھی پہلے کام کی طرح از حد مشکل ہے۔ لیکن ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ کسی ایسے کام کو جس پر نسل انسانی کی نلاح و نجات کا انحصار ہو جس اسکے اشکال کی وجہ سے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ اور دنیا میں وہ کون سا

مشکل کام ہے جس کو حل کرنے میں انسان کا آہنی عزم نا کام رہ گیا ہو۔
 آج مستقبل کی تعمیر جدید کے لئے جس مقدس جماعت سے خدائے قدوس
 کام لینے والے ہیں، کچھ تعجب نہیں کہ وہ اپنی خدا داد صلاحیتوں سے مشکل
 ترین کام کو آسان تر بنا دے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

کام کی تیسری منزل ایک ایسی مرکزی تعلیمی درسگاہ کا قیام ہے جہاں
 سب سے پہلے اس جدید نظام تعلیم کا عملی تجربہ کیا جائے اور وہاں ایسے
 بالمال معلم اور مبلغ تیار کئے جائیں جو ملک کے ہر حصہ میں اس طرز کے
 تعلیمی مشن کو رواج دیں۔ اور ہر شہر و قصبہ میں اس جدید نصاب تعلیم کی
 درسگاہیں کھل جائیں۔ اس طرح سے چند سالوں میں ہماری نئی نسلوں
 میں ذہنی اور فکری وحدت و ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ اور موجودہ
 ذہنی انتشار ختم ہو جائے گا۔

وَبِاللَّهِ التَّوْفِیْقُ -

سلسلہ مطبوعات نمبر ۸۲

276

تعمیری انقلاب

۱۰۷

قرآنی اصولِ حکمت

از۔

حیدر زمان صدیقی

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور